ابن سعود

Ibn Saud

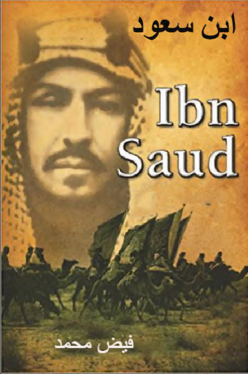

فيض محمد

فہرست مضامین

عرضِ حال

پہلا باب ۔ تمہید ۱-۶

دوسرا باب ۔ ابتدائی حالات ۷-۲۰

تیسرا باب ۔ ریاض کی فتح ۲۱-۴۳

چوتھا باب ۔ رشیدیوں کی شکست ۴۴-۵۷

پانچواں باب ۔ رشید کا انجام ۵۸-۶۸

چھٹا باب ۔ سعودی فتوحات اور الاخوان کی تشکیل ۶۹-۹۱

ساتواں باب ۔ نشیب و فراز ۹۲-۱۰۸

آٹھواں باب ۔ انگریزوں سے دوستی اور سلطنت کی تنظیم ۱۰۹-۱۱۶

نواں باب ۔ درمیانی زمانہ ۱۱۷-۱۳۴

دسواں باب ۔ حسین کی شکست ۱۳۵-۱۴۳

گیارہواں باب ۔ حائل کی فتح اور سلطانِ نجد ۱۴۴-۱۵۲

بارہواں باب ۔ مکہ کی فتح ۱۵۳-۱۶۷

تیرہواں باب ۔ حجاز کی فتح ۱۶۸-۱۸۸

چودہواں باب ۔ اسلامی کانگرس اور مصری محمل ۱۸۹-۱۹۶

پندرہواں باب ۔ اصلاح حجاز ۱۹۷-۲۰۶

سولہواں باب ۔ بغاوتیں ۲۰۷-۲۲۴

سترہواں باب ۔ موجودہ طرزِ حکومت ۲۲۵-۲۳۱

اشاریہ

ابن سعود

عرضِ حال

عہدِ حاضر جس طرح سائنسی دور کہلایا جاسکتا ہے، اسی طرح اسے ہم دورِ قائدین بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے کم و بیش ہر خطے میں قائدین کی ضرورت محسوس ہورہی ہے اور قائدین پیدا بھی ہورہے ہیں۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال ایران میں رضا شاہ، جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی اور روس میں اسٹالن ہر قائد ایک مہتم بالشان انسان دوستانہ مقصد لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا اس کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔

حالات ظاہر کرتے ہیں کہ عرب کی سرزمین کو بھی ایک مصطفےٰ کمال یا ایک رضا شاہ کی ضرورت تھی اور اس نے ابن سعود کو پیدا کرلیا۔ اس زمانہ میں بیرونی اثرات کے تحت عرب سے اسلامی رنگ اُڑتا جارہا تھا اور اسلامی قوانین محض "کتابی اصول" کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن سلطان ابن سعود نے ایک روشنی گھر کی طرح بغاوتوں اور مخالفتوں کے طوفان خیز سمندر میں کھڑے ہو کر عرب میں اسلامیت کے احیاء کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنے مقصد کی بنیادیں اس سنجیدگی اور

فراست سے ڈالیں کہ کرنل لارنس جیسی عظیم الشان شخصیت کی دوربین نگاہ بھی ان کی حقیقی عظمت کو پہچاننے میں دھوکہ کھاگئی۔

—۲—

اس سال گرما کی چھٹیوں میں، میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دنیا کے ان قائدین کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں اور اگر موقع ملے تو ان پر کچھ لکھوں۔ اس دلچسپ مشغلہ کی ابتداء میں نے مصطفےٰ کمال اور ابن سعود کی سوانح عمریوں سے کی، اتفاق سے مجھے ان باکمال اور یگانۂ روزگار ہستیوں پر بہت اچھا مواد دستیاب ہوگیا جن میں ایچ سی۔ آرمسٹرانگ کی بلند پایہ تصانیف "گرے وولف" اور "لارڈ آف ارے بیا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں مکمل سوانح عمریاں ہیں اور بہت ہی تحقیق اور عرق ریزی سے لکھی گئی ہیں مصنف نے ان میں افسانوی اسلوب بیان اختیار کر کے انہیں اور دلچسپ بنادیا ہے۔ مجھے بھی یہ اسلوب بہت پسند آیا اور میں نے اس تالیف کو اسی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب جس وقت زیر تالیف تھی تو بعض احباب نے مجھ سے سوال کیا کہ، "ابن سعود میں ایسی کیا خصوصیت ہے جو آپ نے سب سے پہلے اس پر قلم اٹھایا؟" اس میں کیا خصوصیت ہے؟ اس کا جواب آپ کو ان چند صفحات کے مطالعہ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ ابن سعود پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت میں نے اس لئے بھی

محسوس کی کہ ایک تو یہ مسلمانوں کے ایک اولوالعزم بادشاہ ہیں اور اس مقدس سرزمین پر حکمراں ہیں جس کے ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کی حقیقی دلچسپی وابستہ ہے۔ نیز سلطان کے درخشاں کارنامے ـــــ ان کی خدا پرستی، ان کا صبر و استقلال، ذاتی وجاہت، انہماک کار، خلوص، بہادری، اعلیٰ سیاست ـــــ شخصیت کے وہ گراں قدر اور انمول نگینے ہیں جن کی ستائش ضروری ہے۔ ان سب سے زیادہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے جس چیز نے مجبور کیا وہ یہ ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں سلطان کے حالات مستقل تصانیف کی صورت میں ملتے ہیں لیکن اردو زبان میں اس طرح کا کوئی مواد موجود نہیں۔

ــــــ ۳ ــــــ

ابن سعود کے متعلق اکثر مسلمان مختلف شبہات رکھتے ہیں، اور کبھی میں بھی اسی طرح کے شبہات میں مبتلا تھا۔ لیکن، جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق رہا ہے، ابن سعود کے متعلق یہ بات کہ وہ حدود شرعی اور سختی کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند مسلمان ہیں کوئی بات ایسی نہ مل سکی جس سے اُن کے حقیقی اسلام سے انحراف کا پتہ چل سکے۔ تاہم میں نے اکثر و بیشتر سنجیدہ احباب (جن میں اکثر حاجی ہیں) اور بالخصوص عرب دوستوں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور سبھوں نے بالاتفاق ابن سعود کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا اور یہ بتلایا کہ سلطان ابن سعود کے

مخالف صرف وہی لوگ ہیں جو خود ان کی حقیقی عظمت، ان کی حقیقی زندگی اور ان کے جذبۂ ایمان سے واقف نہیں، بلکہ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن کی حالت

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

کے مصداق ہے۔

میرے سامنے واقعی یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ سلطان ابن سعود کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے میں اور کیا طریقہ کار اختیار کروں۔ سوائے اس کے کہ مستند سوانح عمریوں، نجید، حجاز اور عرب کے صاحب الرائے باشندوں کے بیانات پر اعتبار کروں اور کوئی دوسری صورت ممکن نہ تھی۔ اور میں نے کیا بھی یہی۔

چاہے کچھ کہیے، اتنا ضرور ہے کہ ابن سعود کی زندگی، زندگی کے نشیب و فراز، بہادری کے کارناموں اور اسلامی انصاف اور عدل گستری کا ایک دلکش مرقع ہے۔ ایک شخص عرب کی سرزمین میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جس میں کبھی بادشاہت ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور جو اب مرورِ زمانہ سے افلاس اور تنگدستی کا نمونہ بن گیا تھا ــــــ نہ کھانے کو کھانا اور نہ رہنے کو ٹھکانا ــــــ اس کی ابتدائی زندگی عرب کے ریگستانوں میں وحشی بدویوں کے ساتھ گذرتی ہے، چندروز کے لئے وہ ایک بندرگاہ پر آتا ہے، وہاں اس کے خیالات پلٹا کھاتے ہیں، کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل

کرنے اور عرب کو آزاد کرانے کا خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا ہے
چند آدمیوں کے ساتھ وہ نجد کے دارالخلافہ ریاض پر قبضہ جمانے کے لئے
روانہ ہوتا ہے۔ لوگ اس پر ہنستے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں لیکن
وہ ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، اللہ کا نام لے کر اور اس پر کامل بھروسہ
کر کے، حقیر ساز و سامان کے ساتھ، اپنے چند من چلے ہم خیالوں کے
ہمراہ ریاض پہنچتا اور صرف چھ آدمیوں سے اس بڑے شہر پر قبضہ کرتا
ہے۔ اس کے بعد اس کے ہاتھوں اس کے خاندانی دشمن رشیدیوں
کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چند سال کے اندر اندر وہ عرب کے وسطی
حصہ یعنی نجد کا سلطان بن جاتا ہے، پھر اپنے ملک کو غیر ملکی جوئے
سے آزاد کراتا ہے اور حجاز کی طرف بڑھ کر حسین جیسے بااثر شخص
کو نکال باہر کر کے ارض مقدس سے بدعنوانیوں اور ریاکاریوں کا
استیصال کرتا ہے۔ جاہل، وحشی بدویوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ
انسان بناتا ہے، سارے ملک میں امن پیدا کرتا ہے، عوام
سے قرآن و حدیث کی سختی سے پابندی کراتا ہے۔ غرض ایک
ایسے ملک کو جو صدیوں سے گوشۂ گمنامی میں خاموش پڑا سو رہا
تھا، جگا کر متمدنہ ممالک کی صف میں لا کر کھڑا کرتا ہے۔

اگر حالات یہ ہیں تو کیا ایسے شخص کو بے دین، ایمان فروش
اور نااہل کہنا انصاف کا خون نہیں ہے؟

آخر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہر بڑے کام میں انسان سے

لغزشیں ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر آپ اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب کریں تو حد درجہ انتظام و اہتمام کے باوجود پھر بھی بعض فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں، اس طرح اس عظیم الشان مہم میں، ممکن ہے کہ سلطان ابن سعود یا ان کے ساتھیوں سے کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہو تو کیا ان جزئیات پر خردبینی تنقید کر کے سارے کارناموں پر پانی پھیر دینا قرین مصلحت کہلایا جا سکتا ہے؟

—— ۴ ——

اس کتاب کی تالیف میں مجھے اپنے دوست مولوی عمر یافعی صاحب اور مصوری کے لئے مولوی عزیز الدین صاحب (عثمانیہ) سے کافی مدد ملی میں ہر دو اصحاب کا مشکور ہوں۔ آخر میں، میں توقع کرتا ہوں کہ ناظرین اس کتاب کو غیر جانبدارانہ کوشش تصور کر کے مطالعہ فرمائیں گے۔

المرقوم ۲۵ اسفندار ۱۳۴۵ف
م ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء

فیض محمد

پہلا باب

تمہید

عرب ایک ریگستانی ملک ہے۔ نہ وہاں کافی بارش ہوتی ہے اور نہ دریا ہیں، نہ جنگل ہے نہ مرغزار۔ جس طرف نظر اٹھاؤ سوائے ریگستان اور ریتیلے ٹیلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میلوں تک نہ کوئی درخت نظر آتا ہے اور نہ ہی پانی پینے کے لیے کوئی چشمہ ملتا ہے۔

کئی صدیوں تک عرب کے سرحدی ممالک تمدن کے معراج پر پہنچے اور پھر انہیں زوال ہوا۔ بے شمار سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ مشرق میں دجلہ اور فرات کے کناروں پر بابل اور نینوا کی شاندار حکومتیں، ایران کی مہتم بالشان ترقی، مغرب میں فرعون مصر کی عدیم المثال اور خدایانہ حکومت، ان کا جلال اور شان و شوکت، شمال میں فونیقیہ

اور رُومی سلطنت کا عروج اور پھر ان سب کا زوال ہمارے بیان کا ثبوت ہے۔ غرض عرب کے اطراف واکناف میں تمدن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں لیکن خود عرب اس سے بھی متاثر نہ ہوا اور وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ بیرونی ممالک کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ البتہ تاجروں کی زبانی عرب اور بالخصوص وسط عرب کے کچھ کچھ حالات معلوم ہو جاتے تھے لیکن ان کے بیانات بھی دلچسپ افسانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ یوں تو تاجر کہا کرتے تھے کہ عرب میں بہت سی متمدن اقوام آباد ہیں بڑے بڑے شہر ہیں اور بہت سی عجیب غریب چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے بیان کی تصدیق کا کوئی وسیلہ نہ تھا البتہ حقیقت اس وقت آشکار ہوئی جب حضرت مسیح کی پیدائش سے قبل شاہ آگسٹس نے اپنے مصری گورنر کو سرزمین عرب کی چھان بین کے لیے روانہ کیا۔ اس نے تحقیقات کے بعد بتلایا کہ عرب ایک ریگستانی ملک ہے اور یہاں وحشی قبائل آباد ہیں نہ کھانے کو کھانا ہے اور نہ پینے کو پانی۔ چنانچہ مصری گورنر کے اکثر ساتھی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر راستہ ہی میں ختم ہو گئے۔

عرب میں سوائے جہالت و مظالم کے اور کچھ نہ تھا' اس کے باشندے ایسے ہی وحشی تھے جیسی کہ یہ سرزمین افتادہ اور بنجر ہے۔ چند چشموں اور نخلستانوں پر ان کی زندگی کا دارو مدار تھا اور اسی کے لیے وہ خون کی ندیاں بہاتے تھے۔ بت پرستی' افلاس' ریا کاری اور بدمعاشی کا بازار گرم تھا' ہر قبیلہ اور ہر شخص آزادی کا طالب اور خود مختارانہ زندگی

بسر کرنے کا دعویدار تھا۔ ان منتشر اور سرپھرے قبائل کو رام کرنا، ان سب کو ایک ڈوری میں منسلک کر کے ان پر حکومت کرنی، ماحول کے لحاظ سے کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اور اسی لیے صدیوں سے یہ اسی حالت میں غلطاں و پیچاں رہے۔

ایسے نازک وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربانی مشعلِ ہدایت لے کر عرب کی سرزمین پر تشریف لائے۔ آپ نے چند سال کے اندر اندر عربوں کے منتشر قبائل میں اتحاد پیدا کیا، ان کو گناہوں سے روکا اور سب کو ایک کر دیا۔ دس سال کے اندر سارا ملک عرب آپ کے ساتھ ہو گیا۔ آپ کی تعلیمی تجلیات نے نہ صرف ظلمت کدۂ عرب کو بقعۂ نور بنا دیا بلکہ ان کی ضیا پاری کا اثر ساری دنیا پر پھیل گیا۔ آپ کے تابعین اور تبع تابعین دریائے فرات سے گزر کر ایران تک پہنچے اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ شمال میں شام سے ہو کر ایشیائے کوچک تک جا پہنچے، مغرب میں افریقی ساحل سے ہوتے ہوئے بحیرۂ اوقیانوس اور پھر اسپین، فرانس اور یورپ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اور ایک سو سال کے اندر مسلمانوں کی حکومت آبنائے جبل الطارق سے لے کر دریائے سندھ تک اور ادھر وسط افریقہ سے لے کر ایران تک پھیل گئی۔

لیکن جیسی جیسی اسلامی حکومت ترقی کرتی گئی، عرب اس کا مرکز نہیں رہا بلکہ یکے بعد دیگرے دمشق، بغداد اور قاہرہ اسلامی تمدن کے گہوارے بنتے گئے۔ اگرچہ یہ چراغ عرب میں روشن ہوا اور اس نے سارے عالم میں اجالا

پھیلا دیا لیکن ایک صدی کے اندر ہی وہ خود پھر تاریکی میں آ گیا۔ اس کے بعد سے دنیا نے کئی پلٹے کھائے لیکن عرب ان سب سے الگ تھلگ اور بے تعلق رہا او پھر سے ایک مرتبہ اس پر غفلت کا نشہ طاری ہو گیا۔ ایک ہزار سال تک اس کی یہی حالت رہی۔

لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایک شخص محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوا اور پھر سے اس نے اسلام کے اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو ایک جگہ کرنے کی کوشش کی۔

ابن عبدالوہاب ایک سخت مذہبی جوش والا انسان تھا۔ اسلام میں اعتقادات و تکلفات کی جو فراوانی ہو گئی تھی اُسے دور کر کے وہ اسلام کو اسی سادہ لباس میں دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا جس طرح سرکارِ دو عالم نے تعلیم فرمائی تھی۔ اہل عرب کو اس نے اس طرف متوجہ کیا، وہ اس پر بُری طرح بگڑے اور اس کے سخت دشمن ہو گئے۔ ابن عبدالوہاب نے بھاگ کر دارالخلافہ نجد میں پناہ لی۔ یہاں محمد ابن سعود کی حکومت تھی۔

نجد، عرب کا وسطی علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندے بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ اس کی تین طرف ریگستان ہے اور ایک طرف وادیاں یہ ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس میں کئی گاؤں اور نخلستان ہیں۔ اس سطح مرتفع کے وسط میں ایک زرخیز وادی ہے۔ اس میں کافی پانی ہے، اور کئی نخلستان اور بڑے بڑے باغ ہیں۔ اس وادی میں شہر "ریاض" واقع ہے۔ ریاض نجد کا مرکز ہے اور نجد عرب کا

مرکز۔ اس طرح سے جس کی حکومت نجد پر ہوگی وہ عرب پر اچھی طرح حکمرانی کرسکتا ہے۔

سعود، داریہ اور ریاض کا امیر تھا۔ یہ بڑا لالچی آدمی تھا، اس نے ابن عبدالوہاب کی حقیقی قیمت کو تاڑ لیا اور اس سے اس امر کا پیمان کیا کہ وہ اور یہ دونوں مل کر عرب کے باشندوں کو سچے اسلام کی تعلیم دینگے۔

انہیں کامیابی یقینی تھی۔ سعود ایک بڑا سپاہی اور تلوار کا دھنی تھا اور ابن عبدالوہاب زبردست عالم اور مبلغ۔ سعود لڑتا اور یہ تبلیغ کرتا۔ عرب کے باشندوں پر اس کی تبلیغ کا گہرا اثر ہوا۔ روزہ اور نماز اور قرآن کریم کے دیگر احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جانے لگی۔ شراب اور تمباکو کی سخت ممانعت کردی گئی۔ یکے بعد دیگرے قبائل نے اس کی حکومت تسلیم کی۔ ان کے دشمنوں نے انہیں وہابی کہکر پکارنا شروع کیا۔ لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی اور ساٹھ سال کے اندر تمام عرب پر، یعنی خلیج فارس سے لیکر مکہ اور مدینہ تک اور پھر بحر ہند سے لیکر شام کے کوہ لبنان تک ان کی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اب وہ ریگستان کے بادشاہ تھے۔ خلیفہ اور ترکوں کو مانتے نہ تھے۔ انہیں کسی کی پرواہ نہ تھی، وہ بلا خوف وخطر چوطرف چھاپے مار رہے تھے۔ میسوپوٹومیا پر حملہ کرکے انہوں نے کربلائے معلیٰ کو مسمار کردیا علی پو پر حملہ کرکے اسے باجگزار بنا لیا اور دمشق کی سرحد پر اور بصرہ میں بھی ایک ہنگامہ مچادیا۔ ترکوں نے خطرہ کو پہچان کر اپنے مصری گورنر

محمد علی کو وہابیوں کی تنبیہ کے لیے روانہ کیا۔ اس نے انہیں شکست دی اور وہابی سردار کو پا بہ زنجیر کر کے قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں ایا صوفیہ کی مسجد کے آگے ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے اس کی گردن اُڑا دی گئی۔

وہابیوں کی حکومت گویا ہوا کا ایک جھونکا تھی، جو آن واحد میں آیا اور چلا گیا۔ اب نجد پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ کوئی حوصلہ مند ایسا نہ تھا جو اسے متحد رکھتا، قبائل میں پھر سے انتشار پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ انفرادی آزادی اور خود مختاری کے طالب ہو گئے، باہمی نزاعات برپا ہوئیں، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ عرب گویا قتل و خون اور فساد کا مرکز بن گیا۔ کسی کی جان امن میں نہ تھی۔ ہر شخص غیر مطمئن اور اپنے حریف کی جان لینے کے لیے تیار تھا۔

نومبر ۱۸۸۰ء کے اسی پر آشوب اور ناگفتہ بہ زمانہ میں سعودی خاندان کے ایک رکن عبدالرحمٰن کی بیوی سارا کے بطن سے ریاض کے محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام عبدالعزیز رکھا گیا جو بعد میں چل کر اپنے اجداد کے نام سے

ابن سعود

مشہور ہو گیا۔

دُوسرا بابُ

ابتدائی حالات

(۱)

وہ بچے خوش قسمت ہیں جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں سنجیدہ ماں باپ نے حصّہ لیا ہو، کیونکہ جس تن دہی اور خلوص کے ساتھ ماں باپ توجہ دے سکتے ہیں کوئی دُوسرا یہ کام اس خوبی سے نہیں کر سکتا۔ ایسے بچے آگے چلکر اپنے ماں باپ کا نمونہ بنتے ہیں۔

ابن سعود کی پرورش بھی محل کے اندر ماں کی گود میں اور ماں کے دودھ پر ہوئی۔ اس کی ماں سارا، قبیلہ "دواسر" کے سردار احمد سودیری کی لڑکی تھی، یہ بڑی تنومند اور مضبوط عورت تھی۔ تمام عرب عورتوں کی طرح سات سال کی عمر سے پردہ کرتی اور محل کے اندر ہی رہا کرتی تھی اور جب کبھی باہر نکلتی تو کوئی حبشی غلام اس کے ہمراہ ہوتا۔

اور عرب عورتوں کی طرح وہ بھی پڑھنے لکھنے سے بالکل بے بہرہ تھی۔ البتہ قدرت نے اس میں قوت فیصلہ اور عقل سلیم کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ گھر کا کام کاج اسی کے مشوروں پر چلتا تھا، خاندان کے افراد پر اس کا بہت اچھا اثر تھا اور سب اسے صائب رائے مانتے تھے۔

دودھ چھڑائی تک ابن سعود کی پرورش بالکلیہ ماں کی گود میں ہوئی۔ اس کے بعد اسے ایک حبشی غلام کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا اور اس کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ ابن سعود اکثر محل کے اندر اپنی ماں اور بہن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ماں اسے بہت پیار کرتی تھی اور اس کی بڑی بہن نوری اسے بہت عزیز رکھتی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، زیادہ تر مردانے ہی میں رہنے لگا اور عورتوں سے ملنا جلنا نسبتاً کم کر دیا۔ ابن سعود کے ساتھ اکثر اس کے ہم عمر حبشی غلام رہا کرتے تھے اور اس کی طفیل میں ان کی بھی پرورش ہو جایا کرتی تھی۔ بچپن کے یہی ساتھی آگے چلکر اس کے محافظ دستہ کے قابل اعتماد اور جاں نثار سپاہی بن گئے۔

جب ابن سعود چلنے لگا تو اس کے والد عبدالرحمن نے اس کی تربیت اپنے ذمہ کر لی۔ عبدالرحمن وہابیوں کا امام اور سخت مذہبی آدمی تھا۔ وہابی خود بڑی سخت طبیعت کے لوگ تھے، عیش و آرام سے کنارہ کش تھے، آرائش اور زیبائش سے سخت تنفر تھا، ان کی مساجد، مینار، قبوں اور نقش و نگار سے مزین نہیں ہوتی تھیں، تعیشات مثلاً شراب، مکلف غذا،

تمبا کو، ریشمی کپڑوں وغیرہ سے اجتناب کرنے اور گانے بجانے اور ہر قسم کی موسیقی کے وہ سخت مخالف تھے۔ حتیٰ کہ ہنسی پر بھی وہ غضبناک ہو جاتے تھے۔ ان کا مسلک دنیوی عیش ونشاط سے دور رہ کر وحدہٗ لا شریک لہٗ پر اپنی توجہ مرکوز کرنا اور قرآن اور حدیث پر سختی کے ساتھ عمل کرتا تھا۔ اگر ان کی خوشی دلچسپی اور دلبستگی کا کوئی سامان تھا تو وہ صرف ان کے بال بچے تھے۔ اس کے علاوہ دنیوی آرام وآسائش کو انہوں نے بڑی حد تک اپنے پر حرام کر لیا تھا۔

عبدالرحمٰن نہ صرف ان میں سے ایک تھا بلکہ ان کا امام اور وہابی نقطۂ نظر کی شدت کے ساتھ پابندی کرتا تھا۔ اپنی اولاد کو اس نے وہابیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں ابن سعود کو ریاض کے مدرسہ میں تعلیم کی غرض سے روانہ کیا گیا۔ پہلے تو وہ بہت ہی لاپروا اور کھلنڈرا ثابت ہوا لیکن باپ کی تربیت اور نگرانی نے اس کے میلان طبع کو بدل دیا چنانچہ سات سال کی عمر میں وہ پابندی سے پانچ وقت کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا اور روزہ رکھتا اور اس کم عمری میں وہ قرآن مجید کی اکثر آیتیں نہایت صحت کے ساتھ زبانی تلاوت کیا کرتا تھا۔

عبدالرحمٰن حد درجہ دھن کا پکا اور مستقل مزاج انسان تھا۔ اس کا نصب العین اپنے جد۔ سعود اعظم۔ کی کھوئی ہوئی سلطنت کو پھر سے حاصل کرنا تھا، اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اور ایک مرتبہ تمام عرب قبائل کو ایک ہی زنجیر میں منسلک کر کے، اتحاد اور رواداری پیدا

کرے اور ان سب کو وہابی بنائے۔ اسی مطمح نظر کے ساتھ وہ اپنے مقصد کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ اگر وہ خود اس کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تو کم از کم اس کی اولاد اس کو ضرور پورا کرے۔ چنانچہ اپنی اولاد کی تعلیم میں اس نے ہمیشہ اسی چیز کو پیشِ نظر رکھا۔ یہ کام بڑا ادق تھا۔ اس کیلئے جنگ و جدل کی تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔
اسی مقصد کے لیے ابن سعود کو اس نے تیار کیا۔ تلوار کا فن بتایا، گولی چلانی اور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرنی سکھائی اور اُسے دشوار گزار راستوں سے طویل سفروں پر روانہ کیا کہ وہ تکالیف کو برداشت کرنے کا عادی ہو جائے۔ ہر موسم میں اسے آفتاب طلوع ہونے سے دو گھنٹے قبل جگا دیا جاتا تھا کہ اس میں سستی اور کاہلی نہ پیدا ہونے پائے۔ گرما کے موسم میں عین دوپہر کے وقت ریتیلے میدانوں میں برہنہ پیر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ سختی کا خوگر بن جائے۔ اس تربیت و نگہداشت نے اسے باپ سے بھی زیادہ توانا اور مضبوط بنا دیا۔
اس طرح ابن سعود کو فنِ سپاہ گری سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اس نے ابتداء ہی سے وہ جوہر دکھلائے کہ دیکھنے والوں نے تاڑ لیا کہ یہ آگے چل کر کچھ ہو رہیگا۔
لیکن ابن سعود ریاض کی محدود زندگی کے علاوہ بیرونی دنیا سے بہت کم واقف تھا۔ اہل ریاض بڑے غیور اور شرعی تھے۔ غیر ممالک کے باشندوں سے نہ خود ملتے اور نہ انہیں اپنے پاس پھٹکنے دیتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی تاجر

اپنا مال و اسباب اور غلام لے کر فروخت کی خاطر ریاض آتے تو بیرونی ممالک کے رہنے والوں کی صورت نظر آ جاتی تھی۔

(۲)

ابن سعود کے لڑکپن کا زمانہ بہت ہی خطرہ اور ہڑبونگ کا زمانہ تھا۔ ریاض کی اطراف بدوی (وحشی) آباد تھے۔ شمال میں آل شام محمد ابن رشید کے ساتھ متحد ہو گئے تھے۔ محمد رشید ایک اہل مگر لالچی حکمراں تھا۔ اس نے حائل کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور ریاض اور نجد کے دیگر خوش حال علاقوں کو وہ اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش میں تھا۔ ایسی حالت میں اہل ریاض کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے؟ انہیں ہمیشہ بیرونی حملوں کا خطرہ لگا ہوا تھا، چنانچہ ریاض کے دروازہ پر ہر وقت سپاہی پہرہ دیتے رہتے اور بغیر جھڑتی اور سخت پوچھ گچھ کے کسی کو اندر داخلہ کی اجازت نہ تھی، روزانہ صبح اور دن میں تین مرتبہ جب لوگ نماز کے لیے مسجد جاتے تو شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے کہ اس اثناء میں دشمن اندر داخل نہ ہو سکیں۔

اس کے علاوہ محل کی حالت بھی قلعہ کی سی تھی کیونکہ بیرونی حملوں کے قطع نظر ریاض خانہ جنگیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کے تین بھائی تھے۔ عبداللہ، سعود اور محمد۔ یہ سب اقتدار کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ دس سال تک عبدالرحمٰن کے بڑے بھائی عبداللہ اور سعود میں جھگڑا ہوتا رہا۔ بالآخر

عبداللہ نے سعود کو نکال باہر کر دیا۔ سعود مشرقی صوبہ احساء میں پناہ گزیں ہو کر عجمانیوں سے مل گیا اور انہیں ساتھ لے کر ریاض پر دھاوا بولا اور عبداللہ کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ لیکن اتفاق سے وہ اس دنیا سے بہت جلد کوچ کر گیا۔ اور پھر سے عبداللہ واپس آگیا۔ لیکن ابھی باہمی مخالفتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ سعود کے لڑکے اب بھی اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس طرح سے ریاض میں اب دو بڑے گروہ بن گئے ایک تو سعود کے لڑکے اور اُن کے ساتھی دوسرے عبداللہ اور ان کے شریک۔ یہ علانیہ بازاروں میں لڑتے اور قتل و خون کیا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے اپنے چوتھے بھائی محمد سے مل کر صلح کرنی چاہی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا بلکہ الٹے اسی پر ٹوٹ پڑا اور خود عبدالرحمٰن کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس اثناء میں سعود کے لڑکوں نے عجمانیوں کی حمایت سے حملہ کیا اور عبداللہ کو قید کر کے ریاض پر قبضہ کر لیا۔ ابھی سعود کے لڑکوں کے قدم جمنے نہ پائے تھے کہ اس گڑبڑ میں رشید نے ریاض پر حملہ کیا' انہیں پسپا کر کے ریاض پر قبضہ کر لیا اور عبداللہ کو اپنے ساتھ لیجا کر حائل میں آل شامر کے شیخ سلیم کے پاس نظر بند کر دیا۔

اس لڑائی میں رشید کے ایک بھائی عبید نے محمد کو قتل کر دیا

اس اثناء میں عبداللہ بیمار ہو گیا' رشید نے ایک ایرانی ڈاکٹر سے اس کا علاج کروایا۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کو خطرناک بتایا۔ رشید یہ نہیں چاہتا تھا کہ عبداللہ کے قاتل کی حیثیت سے اپنے دامن پر

دھبّہ لگائے۔ اس لیے اس نے ایک چال چلی، عبدالرحمٰن کو حائل بلوایا اور کہا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ریاض لے جائے۔ لیکن ابھی وہ ریاض پہنچا بھی نہ تھا کہ عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔

(۳)

عبدالرحمٰن کے تینوں بھائیوں کا انتقال ہو چکا، وہ اب بالکل تنہا تھا۔ ابتدا ہی سے وہ غیروں کا مخالف اور اپنے اجداد کی کھوئی سلطنت کو واپس لینے کا دعویدار تھا۔ آل رشید کی مداخلت اور حکومت اس پر بہت شاق گزر رہی تھی، اس نے انہیں بے دخل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس معاملہ میں پہلے اس نے اپنے بھتیجوں سے مل کر کام کرنے کا ارادہ کیا لیکن ان لڑکوں نے اسے غدار کہہ کر موافقت سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ نجد کے ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں سے ملا، ان کے ذریعہ اہل ریاض کو اکسانے کی کوشش کی، قبائل کے نام پروانے بھیجے لیکن سب بے سود، سبھوں نے نفی میں جواب دیا۔ ان پر رشید اور شیخ سلیم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی انہوں نے سر اٹھایا تھا کہ آل رشید نے انہیں نیچا دکھایا۔ ان کا پلہ بھاری تھا۔

عبدالرحمٰن کو ناکامی پر ناکامی ہوتی گئی، اگر دوسرا کوئی اور ہوتا تو اپنے ان ارادوں سے باز آتا مگر عبدالرحمٰن کمزور دل کا انسان نہ تھا، وہ خطرہ کے مُنہ میں، باغیوں اور جاسوسوں کے نرغہ میں استقلال اور

جوانمردی سے کام کرتا اور ہر لحظہ اپنی کامیابی کے لیے نئے نئے منصوبے گھڑتا تھا۔ رشید کو اس کی اطلاع ہوگئی، اس نے سلیم سے کہا کہ وہ عبدالرحمن کو دیکھ لے تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ سعودی خاندان کو دفعتاً نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ "افعی راکشتن و بچہ اش رانگہداشتن کار خردمنداں نیست"۔ اس لیے اس نے یہ تجویز نکالی کہ عبدالرحمن سے ملاقات کا ایک وقت مقرر کر کے خاندان کے تمام اراکین کو ملاقات کے بہانے اسی مقام پر بلا کر سب پر ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔ ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا اور ساتھ ہی اس منصوبے کی اطلاع بھی عبدالرحمن کو ہوگئی، یہ بھی حملہ کی مدافعت کے لیے خفیہ طور پر تیار ہو گیا۔

سلیم مقررہ وقت پر پہنچا۔ عبدالرحمن نے محل کے درباری ایوان میں اس کا استقبال کیا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ چار پی، اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ عبدالرحمن کی سیدھی جانب خاندان کے چند اراکین تھے، ان میں عبدالرحمن کا بچہ سعود بھی اپنے حبشی غلام کے ساتھ موجود تھا۔ سلیم نے خواہش کی کہ خاندان کے اور اراکین بھی ملاقات کے لیے بلوائے جائیں۔ اس پر عبدالرحمن نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ برہنہ تلواریں لیے بجلی کی طرح اندر ٹوٹ پڑے، لڑائی شروع ہوگئی۔ عبدالرحمن کے لوگوں نے سلیم کے ساتھیوں کی خوب خبر لی اور سلیم گرفتار کر لیا گیا۔

ابن سعود نے یہ اپنی عمر میں پہلی دفعہ قتل وخون کا نظارہ کیا!

یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ دیہاتی اور ہمسایہ قبائل رشید کے مظالم سے تنگ آچکے تھے، انہوں نے عبدالرحمٰن کا ساتھ دیا۔ ادھر رشید نے بھی بڑا زور مارا اور ہر دفعہ عبدالرحمٰن کو شکست دی۔ تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی، جنگ وجدل کا بازار گرم ہوگیا اور لوگ فاقے کرنے لگے۔ سبھوں نے عبدالرحمٰن کو صلح کے لیے مجبور کیا، اس نے پہلے انکار کیا لیکن بعد کو مانتے ہی بنی۔ مجبور ہوکر اس نے صلح کے لیے آدمی بھیجے اور ضمانت میں اپنے لڑکے عبدالعزیز کو روانہ کیا اور سلیم کو چھوڑ دیا۔ اب تمام ملک پر آل رشید قابض تھے۔ صلح کے بعد رشید عبدالرحمٰن کو ریاض کا عامل بناکر حائل چلا گیا۔ رشید کی واپسی کے بعد قبائل پھر اس کے خلاف ہوکر عبدالرحمٰن سے مل گئے۔ عبدالرحمٰن ان کو ساتھ لیکر رشید پر حملہ کرنے کے لیے حائل کی طرف روانہ ہوا۔ اس دفعہ عبدالرحمٰن کا دس سالہ لڑکا ابن سعود بھی، اپنے حبشی غلام کے ساتھ باپ کے ہمراہ لڑائی کے لیے روانہ ہوا۔

(۴)

عبدالرحمٰن کی یہ کوشش محض ایک ولولہ تھا، اس میں اتنی سکت کہاں تھی جو رشید کا مقابلہ کرسکتا، شہر والے گذشتہ محاصرہ سے تنگ آکر صلح کے لیے مصر تھے اور اکثر قبائل گو رشید کے مخالف تھے تاہم ان کے دلوں میں رشید کا اس قدر ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ اس سے

ڈبھیڑ کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی ان حالات کے تحت اگر عبدالرحمٰن پسپا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ رشید نے عبدالرحمٰن کا بُری طرح پیچھا کیا اور قسم کھائی کہ اب کی دفعہ وہ ان زہریلے سانپوں کا قلع قمع کر کے رہیگا۔

اب عبدالرحمٰن کے لیے بڑا نازک وقت آگیا۔ اس نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی اور ایک رات اپنے خاندان کو لے کر صبح ہونیسے پیشتر اونٹوں پر سوار ہو شہر کے مشرقی پھاٹک سے چپ چاپ روانہ ہو گیا اور احسا، پہنچکر آل عجمان کے شیخ کے پاس پناہ لی۔ آل عجمان نے ریگستانی قانون کے مطابق اسے پناہ دی مگر عبدالرحمٰن آل عجمان کی غیر مستقل مزاجی اور ان کے متلون طبائع سے خوف واقف تھا' وہ جانتا تھا کہ اگر آج نہیں تو کل یہ ضرور ایک دم مخالف ہو جائینگے۔ ان دنوں ابن سعود "گٹھیائی بخار" میں مبتلا تھا' عبدالرحمٰن نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور خاندان کے دُوسرے افراد کو "جزیرہ بحرین" روانہ کر دیا۔ اس طرح خاندان کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے اطراف کے قبائل سے گفت وشنید شروع کی لیکن سبھوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے چند بدویوں کو اُبھار کر ریاض پر حملہ کیا لیکن نجدیوں کی امداد نہ دینے کی وجہ سے اسے بُری طرح پسپا ہونا پڑا۔

جب وہ واپس لوٹا تو احساء کے ترکی عامل نے اسے یاد کیا۔

عرب میں ترکوں کی حکومت برائے نام تھی۔ انہیں صرف چند خوش حال مقبوضات مثلاً یمن، عسیر، حجاز وغیرہ پر تسلط حاصل تھا۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ترکوں نے ایک مخصوص پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ یہ کہ مختلف قبائل کو آپس میں لڑا دینا اور کسی قبیلہ یا اس کے سردار کو ابھرنے نہ دینا۔ اس طرح انہوں نے عرب کی منتشر قوتوں میں ایک طرح کا توازن قائم کر رکھا تھا۔ لیکن اب چونکہ سعودیوں کو کافی شکست ہو چکی تھی اور آل رشید زور پکڑ رہے تھے اس لیے انہوں نے سعودیوں کی طرف داری شروع کی اور عبدالرحمٰن کو امداد دینے کا وعدہ کیا لیکن عبدالرحمٰن نے صاف طور پر ان کی امداد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک سچا عرب تھا، ترکوں کی امداد قبول کرنا اس کی شان اور فطری غیرت کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ وہ عرب میں ترکوں کے بیجا دخل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کے کئی دشمن ہو گئے۔ آل رشید، آل عجمان، سعود کے لڑکے اور ترک۔ احساء میں اس کی خیر نہ تھی اس لیے ابن سعود کو ساتھ لے کر اس نے "ربع الخالی" کا رخ کیا۔ یہ ایک وسیع ریگستان اور بنجر علاقہ ہے، یہاں بنی مرہ آباد تھے وہ ان کی پناہ میں آ گیا۔

(۵)

مرہ قبائل بڑے وحشی تھے، یہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، کھجور اور اونٹوں کا دودھ ان کی غذا تھی۔ کبھی کبھی گوشت بھی کھا لیا کرتے تھے۔ ان کے کوئی گاؤں نہ تھے۔ غذا کی تلاش میں

وہ ہمیشہ خانہ بدوش رہتے تھے ۔ لوٹ مار ان کا خاص شغلہ تھا ۔ ان کی لوٹ مار کا دائرہ حضرموت اور عمان تک پھیلا ہوا تھا ۔

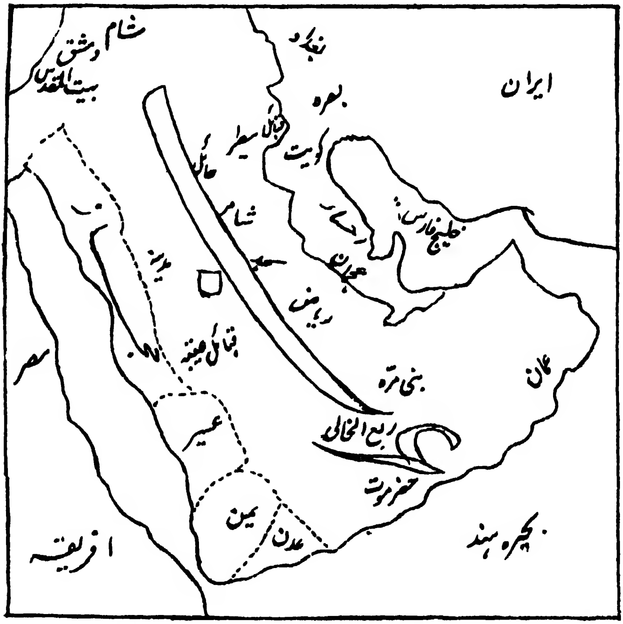

ابن سعود نے کئی ماہ تک ان وحشیوں کے ساتھ زندگی بسر کی ۔ اس زندگی نے اسے ایک مضبوط اور بہادر بدوی بنا دیا ۔ وہ بغیر سایہ کے کھلے میدانوں میں سوتا، ان کے ساتھ سفر کرتا، لوٹ مار میں ان کا شریک رہتا اور خوب شکار کرتا تھا ۔ بنی مرہ نے بھی اسے اکثر ریگستانی گُر بتلا دیے کہ کس طرح ریت پر پیر کے نشانوں سے راستہ تلاش کیا جاتا ہے اور کیونکر طویل سفروں میں اونٹوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے ان کی بیماریوں کا کیا علاج ہے کھوراک

دُودھ کی ایک مشک کے ساتھ کیسے ریگستان میں طویل سفر طے کیے جاتے ہیں؟ یہ سب باتیں ابن سعود کی آئندہ زندگی کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوئیں جن سے اس نے آگے چل کر خوب فائدہ اٹھایا۔

عبدالرحمٰن کو یہ وحشیانہ زندگی مطلقاً ناپسند تھی۔ باشندگان مرّہ جاہل اور لا مذہب تھے۔ ان کی بدتمیزی سے عبدالرحمٰن کے غرور اور مذہبی احساسات کو ٹھیس لگتی تھی اس نے انہیں آلِ رشید کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی آزاد اور خودمختار زندگی کو چھوڑ کر ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے اس خصوص میں اکثر قبائل کے شیوخ کو تفصیلی خط لکھے لیکن سب نے اسے خطرناک انسان سمجھ کر ٹکا سا جواب دیدیا۔

عبدالرحمٰن کو اس سے سخت ناامیدی ہوئی۔ عمر بھی اب پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ چاہتا تھا کہ اپنے بال بچوں میں کچھ دن آرام کی زندگی بسر کرے۔ لیکن حالات اس کے موافق نہ تھے۔ اسی اثناء میں کویت (بندرگاہ) کے شیخ محمد نے اسے کویت آنے کی دعوت دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں احساء میں ایک نیا ترکی حاکم حافظ پاشا نامی آیا ہوا تھا' رشید کی قوت بڑھتی جارہی تھی اور وہ آئے دن ترکوں اور بندرگاہ کویت: دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہورہا تھا اس لیے گورنر نے رشید کے زور کو کم کرنے کے لیے عبدالرحمٰن کی ضرورت محسوس کی اور کویت کے شیخ کے توسط اسے بلا بھیجا اور وظیفہ

دینے کا وعدہ کیا۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ عبدالرحمٰن نے شیخ کی دعوت کو خوشی سے لبیک کہا اور کویت آکر اپنے بال بچوں کو بحرین سے بلوالیا اور یہیں رہنے لگا۔

تیسرا باب
ریاض کی فتح

(۱)

کویت ایک ریگستانی شہر تھا، سرسبزی و شادابی نام کو نہ تھی۔ یہاں سعودی خاندان، ایک چھوٹے سے مکان میں پناہ گزیں ہوا جس میں صرف تین کمرے تھے۔ اتنے بڑے خاندان کے لیے اتنا چھوٹا سا مکان کیا کافی ہوتا؟ محل کی زندگی کے بعد یہ ایک قید خانہ معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال یہ خاندان بڑی عسرت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ وظیفہ بھی وقت پر بہت کم ملا کرتا۔ کیونکہ خود ترک شیخ کو دیر سے رقم دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شیخ بذاتِ خود سعودی خاندان کا سرے سے مخالف تھا اور وہ تو صرف ترکوں کا اشارہ تھا جو اس نے اس خاندان کو پناہ دی۔

تھوڑے دن بعد ترکوں نے عبدالرحمٰن کو ترکی فوج کے ساتھ

ریاض پر حملہ کرنے کے لیے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ وہ ترکوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن کر کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے تو ان کے اس طرح حکم دینے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ جب معلوم ہوا کہ اسے وظیفہ ترکوں کی طرف سے ملا کرتا ہے تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن کرتا کیا؟ پہلے ہی اسے اگر اس کا علم ہوتا تو ترکوں سے امداد لے کر زندہ رہنے کے بجائے وہ فاقہ کی موت کو ترجیح دیتا مگر اب اس کی حالت سقیم تھی اور رقم کی واپسی امکان سے باہر۔ "قہر درویش بجان درویش" کے پیچ و تاب میں رہا۔ ترکوں نے بھی اس کا یہ طور دیکھ کر وظیفہ بند کر دیا۔ اب اس خاندان پر بڑی مصیبت آ پڑی۔ کھانے اور کپڑے کی بھی محتاجی ہو گئی۔ قرضے کے سوائے اور کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ عبدالرحمٰن کی غیرت کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حامی نہیں بھرتی تھی۔ لیکن عسرت نے اسے اس کے لیے بھی مجبور کر دیا۔

جب ابن سعود کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو اس کی ماں نے ایک بدوی لڑکی سے اس کی شادی کی قرار داد کر لی لیکن شادی کے موقع پر عبدالرحمٰن کے پاس پیسہ نہ تھا اس لیے شادی ملتوی کرنی پڑی مگر عین وقت پر ایک سوداگر نے بہت ہی کشادہ پیشانی سے ان کی امداد کی اور ابن سعود کی شادی ہو گئی۔ کویت کی زندگی ابن سعود کے لیے تجربات کی ایک وسیع دنیا تھی۔

اب تک وہ صرف ریاض کی نری مذہبی زندگی اور ریگستان کے رہنے والے متمرد قبائل کے وحشی پن سے واقف تھا اس کے سوائے

جدید تمدن کی اسے ہوا ابھی نہیں لگی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ابن سعود کی آنکھیں کھل گئیں۔ کویت اس زمانہ میں خلیج فارس کا ایک عظیم الشان بندرگاہ تھا۔ بمبئی، طہران، دمشق، ترکی، انگلستان وغیرہ سے تاجر یہاں آیا کرتے اور یہیں سے وسط عرب اور شام کے لیے قافلے روانہ ہوا کرتے۔ کویت کی آبادی کافی تھی اور شہر میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ ابن سعود بھی یہاں ایک معمولی عرب نوجوان کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ساحل پر جا کر ایک وہ ملاحوں کی گفتگو سنتا ہوٹلوں میں مسافروں اور تاجروں سے مختلف قسم کی باتیں ہوتیں بغداد، دمشق اور قسطنطنیہ کی خبریں سنا کرتا اور بیرونی ممالک کے باشندوں کے حالات تفصیل کے ساتھ دریافت کرتا تھا۔ اپنے ہم عمروں سے ہنس بول لیا کرتا اور کبھی ان سے لڑتا بھڑتا بھی تھا۔ نماز کے وقت اپنے باپ کے ساتھ برابر مسجد جاتا اور نہایت پابندی سے روزے رکھتا تھا۔ ابن سعود کبھی ساحلی تماش بینیوں کا شکار نہیں بنا، اس کے دو وجوہ تھے، ایک تو بذات خود سخت مذہبی تھا اور دوسرے اس کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ چیز اس کی زندگی کو کامیاب بنانے میں بڑی مفید ثابت ہوئی ورنہ ایک نوجوان کا جو دنیا کے اتار چڑھاؤ سے بے بہرہ ہو اور جس نے اپنی ابتدائی زندگی وحشیوں میں گزاری ہو ساحلی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد کر دینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

اس زمانہ میں کویت کا شیخ، محمد تھا اس کے بھائی مبارک سے عبدالرحمٰن کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ اکثر ان کے پاس ملاقات کے لیے آتا تھا۔ محمد اور مبارک کے تعلقات بہت زیادہ ناخوشگوار تھے۔ چند سال پیشتر ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی تھی اور مبارک ناراض ہو کر بمبئی چلا گیا تھا۔ یہاں اس نے اپنی تمام دولت جوئے اور آوارگی کی نذر کر دی حتیٰ کے قرضوں کی ادائی میں اسے اپنی ماں کے زیورات بھی فروخت کرنے پڑے اور آخر میں جب وہ بالکل قلاش ہو گیا تو کویت واپس آنے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ محمد نے بھائی ہونے کی حیثیت سے اپنے پاس تو رکھا لیکن اسے اس سے سخت نفرت تھی۔ مبارک عام طور سے بہت مخیر اور ملنسار واقع ہوا تھا۔ جس کے باعث اسے رعایا بہت چاہتی تھی۔ یہ چیز محمد کو بری طرح کھٹکتی رہی اور اسی سے وہ خائف بھی تھا۔ محمد نے مبارک کو ہمیشہ پیسے سے مجبور رکھنے کی کوشش کی اور جب بھی موقع ملا اسے عوام میں ذلیل کرنے سے نہیں چوکا۔ مبارک ابن سعود پر بہت مہربان تھا بلکہ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا اور اپنے گھر بلا کر اکثر اس سے کام کی باتیں کیا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد حالات بالکل بدل گئے۔ مبارک اپنے بھائی کے سلوک سے تنگ آکر ایک بھائی کی مدد سے اسے قتل کر ڈالا اور کویت کا شیخ بن بیٹھا۔ شہر والے محمد کی کنجوسی اور مظالم سے

تنگ آ گئے تھے ۔ مبارک کی دریا دلی اور فیاض طبیعت نے ان کے دل کو پہلے ہی سے موہ لیا تھا ۔ رعایا نے اس کی حکومت کو خوش آمدید کہا۔ مبارک کی دوستی کے باعث سعودی خاندان کو شہرت ہونے لگی ۔ مبارک کا سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ نہایت اچھا تھا ۔ ابھی مبارک کو شیخ بنے ہوئے کچھ دن ہی گذرے تھے کہ ریاض سے خبر آئی کہ نجد اور اطراف کے قبائل رشیدیوں کے خلاف بغاوت کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ان کی رہبری کرے ۔ ابن سعود کی عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی قیادت کے لیے تیار ہو گیا اور فوراً ایک اونٹ مستعار لے کر اپنے چند سرپھرے ساتھیوں کے ہمراہ ریاض کی طرف روانہ ہوا ۔ یہ اطلاع بے بنیاد تھی۔ اہل ریاض بغاوت کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ مبارک نے بھی ابن سعود کو کچھ امداد نہیں دی کیونکہ وہ خواہ مخواہ اور ایسے نازک وقت میں رشیدیوں سے الجھنا عقلمندی کے خلاف سمجھتا تھا ۔ ابن سعود کا یہ جوش حقیقت میں بچپن تھا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے' اس قدر اہم کام کے لیے' بلا کسی امداد کے روانہ ہو گیا اور وہ بھی ایک بوڑھا اور بیمار اونٹ لیکر۔ راستہ میں اس کا اونٹ لنگڑا ہو کر گرا اور مر گیا۔ اسے وہاں سے واپس لوٹنا پڑا ۔ اتفاق سے رستہ میں ایک قافلہ مل گیا ۔ ان لوگوں نے اسے سامان کے اونٹ پر بٹھا کر کویت پہنچا دیا جب ابن سعود اپنے مقام پر پہنچ گیا تو تمام لوگوں نے اس کی طفلانہ حرکت کا خوب مضحکہ اڑایا ۔

اس اثناء میں واقعات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ آن واحد میں کویت کو عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی۔ وہ اس طرح سے کہ جرمنی میں آبادی اور قوت حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ قیصر چاہتا تھا کہ اپنی سلطنت کو وسعت دے لیکن کس طرح؟ وسعت کا راستہ صرف مشرق کی طرف کھلا ہوا تھا اور ہندوستان پر ان کی نظریں گڑی ہوئی تھیں۔ سب راستے انگریزوں کے قبضہ میں تھے۔ البتہ ایک راستہ کھلا تھا جو ترکی سے ہوتے ہوئے ممالک عرب سے گذرتا ہوا خلیج فارس میں پہنچتا ہے۔ اس لیے قیصر نے سلطان ترک سے دوستی کر لی۔ انہیں اسلام کا خلیفہ اور عربوں کا محافظ تسلیم کر لیا اور مشرق میں اپنے لوگ روانہ کیے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ قسطنطنیہ سے علی پو اور پھر بغداد تک ریل کی پٹڑی ڈالنا اور کویت کو جنکشن بنانا ضروری خیال کرتا تھا کیونکہ کویت ہی خلیج فارس کی کنجی تھی۔

انگریز بھی کچھ نہیں تو برابر ایک صدی سے ہندوستان کی طرف سے خلیج فارس کے لیے زور مار رہے تھے اور ساحل کے مقامی شیوخ سے اتحاد پیدا کر کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اب جب انہوں نے دیکھا کہ جرمن اس کے لیے کوشاں ہے تو وہ کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے؟ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی طرح جرمنی ان کے راستہ میں حائل ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مقابل آگئیں جس سے کویت کی اہمیت بڑھ گئی۔

مبارک بہت ہی جہاں دیدہ تھا۔ وہ موقع کی اہمیت اور اپنی حیثیت کو سمجھ گیا۔ انگلستان، روس، جرمنی سے اس کے پاس نمائندے آنے لگے۔ ان لوگوں کے منصوبوں سے واقف ہونے کے لیے مبارک نے بھی اپنے جاسوس لگا دیے۔ اب وہ پہلے کی طرح آوارہ اور شراب خوار نہ تھا بلکہ ایک مستعد، ہوشیار اور معاملہ فہم انسان بن گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر جرمنوں کو ریل کی پٹڑی بچھانے میں کامیابی ہو گئی تو بس کویت کا خدا حافظ ہے۔ وہ سب کو وعدہ فردا پر ٹالتا گیا۔

جرمنوں نے اس کی یہ فراست دیکھ کر ایک چال چلی اور سلطان ترکی سے مل کر اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور معزول کرنے کی سازش کی گئی۔ مبارک کو ان منصوبوں کی اطلاع ہو گئی اور وہ فوراً انگریزوں سے مل گیا۔ ترکوں نے رشیدیوں کا ساتھ دیا اور ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ مبارک ان کے خلاف سعودیوں کو امداد دے رہا ہے۔ یہ بات رشیدیوں کے سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے فوراً کویت پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

(۳)

مبارک بھی خطرہ کو تاڑ گیا، اب وہ بڑی ادھیڑبن میں پڑ گیا۔ اس کے پاس نہ تو کافی فوج تھی اور نہ ہی کویت کے باشندے جنگ جدل اور مقابلہ کے اہل تھے۔ شہر کی فصیل بھی بوسیدہ ہو چکی تھی اور محاصرہ کی مدافعت بھی اس کے بس سے باہر تھی، بہر حال اس نے آنے والے

خطرہ سے آگاہ ہوکر مدافعت کے انتظامات شروع کر دیے اور اطراف کے قبائل کے نام اتحاد کے لیے پروانے بھیجے۔ مرہ، عجمان، مطیر قبائل اور منتفک کے شیخ سعدن نے اس کا ساتھ دیا۔ ساتھ ہی اس کے مبارک نے عبدالرحمٰن اور ابن سعود سے بھی اتحاد اور دوستی کا پیمان کرلیا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ضرورت کے وقت نجدیوں سے امداد دلائینگے۔

لیکن اسی اثنا میں عبدالرحمٰن کو مبارک کی گذشتہ زندگی کے حالات معلوم ہوگئے جس سے وہ بدظن ہوگیا۔ اس کے علاوہ مبارک کا طرز زندگی بھی اسے کچھ بھاتا نہ تھا۔ وہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہا کرتا تھا۔ زرق برق پوشاک پہنتا تھا۔ اس کا محل قیمتی فرنیچر اور چند تصویر بتاں سے آراستہ پیراستہ تھا۔ وہ نماز روزہ کا بھی کچھ ایسا زیادہ پابند نہ تھا بلکہ عورتوں کا گانا سنتا اور شراب پیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں وہابی عقائد (فی الحقیقت اسلام) کے خلاف تھیں اس لیے عبدالرحمٰن کو مبارک کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی اور اس نے اپنے لڑکے ابن سعود کو بھی اس کی صحبت میں رہنے سے منع کردیا۔ مگر ابن سعود کسی خاص مقصد کے تحت خفیہ طور پر اس سے ملا کرتا تھا۔

مبارک اور ابن سعود میں بہت گہری دوستی ہوگئی۔ مبارک ہمیشہ اسے اپنے ہمراہ رکھتا اور اکثر معاملوں میں اسی سے مشورہ کرتا اور پیچیدہ معاملات کے نکات کو اسے بتلاتا تھا۔ اس سے ابن سعود کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اب تک اسے اس قسم کی باتوں سے

دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ابن سعود کو پہلی دفعہ غیر ممالک کے لوگوں یعنی انگلستان، فرانس، اور جرمن کے نمائندوں سے ملنے، ان کی گفتگو سننے اور ان کے طرز زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مبارک ان سے خاص ڈھنگ سے ملا کرتا تھا۔ حقیقت میں اسی کی ہمت اور اسی کا تجربہ تھا جو وہ کویت پر اس سنجیدگی کے ساتھ حکومت کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کویت مختلف قسم کے لوگوں کا مرکز تھا، بیرونی ممالک کے تاجر اکثر وہاں آیا کرتے تھے اور عرب کے اکثر علاقوں کو جانے والے قافلے وہیں سے ہو کر گذرتے تھے۔ مبارک کے لیے ان سب سے نبٹنا اور ان سب سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ضروری تھا۔

دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں کویت پر دنیا کی دو بڑی قوتیں دانت لگائے بیٹھی تھیں۔ ایسے نازک وقت میں اگر یہ ذرا بھی بزدلی سے کام لیتا یا اس سے ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو کویت ہمیشہ کے لیے اس کے کیا بلکہ عربوں کے قبضہ سے بھی نکل گیا ہوتا۔ اسی لیے اس نے میانہ طریق کار اختیار کر رکھا تھا اور اسی میں اس کی نجات تھی۔

ایسے زمانہ میں مبارک کا ساتھ ابن سعود کے لیے آیۂ رحمت ثابت ہوا اور وہ رفتہ رفتہ مختلف قسم کی سیاسی چالوں اور مختلف استعداد کی حکومتوں سے نازک سے نازک مسئلوں پر گفت و شنید کرنے کے ڈھنگ سے روشناس ہوتا گیا پہلے ہی سے وہ بہت ذکی الطبع واقع ہوا تھا ان حالات نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

ابن سعود میں اب خود اعتمادی پیدا ہو گئی وہ مستقبل کے خوش آئندہ خواب دیکھنے لگا اور اپنے ساتھیوں سے فخریہ انداز میں کہتا تھا کہ میں ریاض اور نجد کا وارث ہوں اور ایک نہ ایک دن رشیدیوں کو ریاض سے بے دخل کر کے رہونگا۔ سب لوگ اس کے باتوں پر ہنستے اور اس کی پہلی مہم کی یاد دہانی کر کے پھبتیاں اڑاتے لیکن ابن سعود ان باتوں سے پست ہمت ہونے والا نہ تھا بلکہ اس کے ارادے پہلے سے زیادہ مضبوط ہونے لگے۔

(۴)

مبارک چاہتا تھا کہ رشیدیوں سے پہلے خود اس پر حملہ کر دیے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور جب دس ہزار آدمی جمع ہو گئے تو حملہ کے لیے روانہ ہوا اور اپنے ساتھ عبدالرحمن کو بھی لے لیا۔ عبدالرحمن نے ابن سعود کو جنوب کی طرف روانہ کیا تاکہ ادھر سے تھوڑی بہت قوت جمع کر کے ریاض پر حملہ کر دے۔ ابن سعود اپنے چچیرے بھائی جلوی اور نجد کے چند بہادر نوجوان ساتھیوں کو لیکر جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ اور ریگستان کے اکثر قبائل سے مل کر اپنے مقصد کو ان کے آگے پیش کیا۔ رشیدیوں کی سختیوں سے قبائل تنگ آ چکے تھے اور پھر سے سعودی حکومت کے خواہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اور بیشتر قبائل نے ابن سعود کا ساتھ دیا اور جب وہ ریاض کی طرف بڑھا تو اس کے ساتھ ایک بڑی فوج تھی۔

اسی اثناء میں یکایک شمال سے خبر آئی کہ قصبہ صارف کے پاس

رشیدیوں کا مبارک سے مقابلہ ہوا۔ مبارک کے ہمراہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ منطفاک بھی انجان ہو گیا' عجمانیوں نے بھی دغہ دی اور مبارک بے یارو مددگار رہ گیا اور اگر اس موقع پر زور دار بارش نہ ہوتی تو مبارک ٹھنڈا ہو گیا ہوتا۔ یہ خبر سن کر اکثر قبائل گھبرا گئے۔ ان پر پہلے ہی سے رشیدیوں کی دھاک تھی اب تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور سبھوں نے چپکے سے گھروں کا رُخ کیا۔ یہ حال دیکھکر ابن سعود اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ کویت واپس آیا اس کے کچھ بعد ہی رشید ریاض پہنچا اور سزا کے طور پر اس نے نجد کے اکثر گاؤں جلوا دیے شہر بریدہ میں ایک سو اسی سرداروں کو سولی دی اور دوسروں پر سخت جرمانے کیے۔ یہاں سے وہ مبارک کی طرف پلٹا۔ مبارک بالکل بے بس تھا اس کے دوستوں نے عین وقت پر اس کا گلا کاٹا۔ اس کے پاس فوج تھی اور نہ ہی اس کا شہر فصیل سے محصور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی خاندان بھی جھگڑے میں آ گیا۔ عبدالرحمٰن نے ارادہ کیا کہ دشمن آنے سے پہلے ہی فرار ہو جائے لیکن اس اثنا میں انگریز آ گئے۔ انہوں نے مبارک کا ساتھ دیا اور رشید کو واپس جانے کی دھمکی دی۔ رشید واپس چلا گیا۔

(۵)

رشید نے مبارک کو علانیہ شکست دیدی تھی۔ یہ تو انگریزوں کی وجہ تھی کہ وہ بال بال بچ گیا ورنہ اگر انگریز بیچ میں نہ آتے تو رشیدی

مبارک کی حکومت کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیتے ۔ لیکن اس کے باوجود ابن سعود اس کو شکست تسلیم نہیں کرتا تھا ۔ اس کی عمر اس وقت بیس سال کی تھی ۔ وہ مضبوط تنومند، دلیر اور مستقل مزاج بدوی تھا اس میں جوانی اور خاندانی شرافت کا خون موجیں مار رہا تھا ۔ اس کی بھوری آنکھوں سے غصہ کے مارے آگ کے شعلے نکل رہے تھے ۔ اس نے بھائیوں کو لعنت ملامت کی، وہ باغی، فاسق اور فاجر تھے ۔ اپنے ساتھیوں کے سولی دیے جانے پر وہ آگ بگولا ہوگیا اور مبارک کو جنگ کے لیے اُبھارا لیکن اس نے اپنی حالت کا اندازہ کرکے صاف انکار کردیا ۔ اس کے بعد خود اس نے مختلف قبائل کے شیوخ سے مل کر امداد چاہی لیکن سبھوں نے صارف کا قصہ سنا کر سکوت اختیار کیا ابن سعود کو ہر طرف سے ناکامی ہوگئی اب ابن سعود بے حد بے چین تھا، کاہلی کی زندگی سے وہ قبر کے گوشہ کو زیادہ آرام دہ سمجھتا تھا ۔ لوگوں کے طعنوں تشنوں سے اس کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا ۔ وہ جنگ کے لیے بالکل تلا ہوا تھا ۔ عبدالرحمٰن نے اسے بہت کچھ روکا اور اس کے بھڑکے ہوئے جذبات کو دبانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی ۔ اہل نجد پر اسے کامل بھروسہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر ان کی مناسب رہبری کی گئی تو وہ رشیدیوں کو بے دخل کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں گے ۔ ابن سعود اپنے خیال کی تکمیل کے لیے ہر طرح تیار تھا ۔ لیکن اس کے پاس روپیہ پیسہ، اونٹ اور آلات حرب کی کمی تھی ورنہ کبھی کا وہ اس مہم کے لیے

روانہ ہو جاتا۔ مبارک سے اس نے امداد کے لیے درخواست کی۔ مبارک ایک سنجیدہ اور جہاں دیدہ انسان تھا۔ اس نے پہلے تو سمجھایا بجھایا اور حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی مگر ابن سعود اپنی بات پر اڑا رہا۔ بالآخر مبارک نے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ تیس اونٹ، بیس بندوقیں اور دو سو "ریال" (ایک قسم کا سکہ) اس کے حوالہ کیے۔

اب کیا تھا، ابن سعود کی مُراد برآئی۔ اس نے ذرا بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی دو بیویوں اور پہلی مرحومہ بیوی کے لڑکے ترکی کو والد کے پاس چھوڑ کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

ان میں جلوی اور اس کا بھائی محمد بھی شامل تھا۔ سفر کی پوری تیاری کے بعد ابن سعود رشتہ داروں سے ملنے کے لیے گھر آیا۔ ماں باپ نے بہتیرا سمجھایا کہ ابھی وقت نہیں آیا لیکن اس کی بہن نورہ نے باپ کی بات کاٹ کر بھائی کی ہمت افزائی کی۔ وہ ابن سعود سے زیادہ جوش میں تھی۔ بالآخر عبدالرحمن نے رخصت کی اجازت دی اور یہ مختصر سا قافلہ ایک عظیم الشان مقصد کے ساتھ، رات کی تاریکی میں ریگستان کی طرف روانہ ہوا۔ ابتدا ہی سے ابن سعود کو کامیابی ہوتی گئی کیونکہ ریگستانی سفر کے متعلق وہ مرّہ میں کافی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس تجربہ نے یہاں اس کی بڑی رہبری کی اور قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ راستہ میں اگر مخالفین کا کوئی قافلہ یا گروہ مل جاتا تو یہ لوگ مار پیٹ کر کے روپیہ پیسہ اور آلاتِ حرب چھین لیتے

اور فوراً دوسری طرف ۵۰ میل تک نکل جاتے ۔ ابن سعود راتوں کو بہت کم سوتا تھا ۔ گرم ریت میں گڑھا بنا کر گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیتا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوتا تھا ۔ اور جب سب لوگ تھک کر سو جاتے تو خود ان کی حفاظت کیا کرتا تھا ۔

ابن سعود کو لڑائی سے خاص شغف تھا اور وہ بھی دُو بدو لڑائی سے۔ وہ شیر کی طرح گرجتے ہوئے دشمن پر حملہ کرتا اور ایسے وار لگاتا تھا کہ دشمن کی صفیں بکھر جاتی تھیں کسی شخص کو اس کے مقابلہ کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اس کی اس بہادری کو دیکھکر اس کے ساتھیوں کے دل اور بھی بڑھ گئے۔ احسار کے قریب اس نے ایک عجمانی اور ایک رشیدی قافلہ کو لوٹ لیا اسطرح بہت سا مال غنیمت اس کے ہاتھ آگیا ۔ اب اس کے پاس کافی روپیہ جمع ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ابن سعود بہت ہی دریا دل واقع ہوا تھا جس کے باعث بدوی اس کے اطراف جمع ہونے لگے ۔ لیکن وہ ابھی مطلئن نہ تھا ۔ کیونکہ اس کا مقصد بدویوں کو فراہم کر کے لوٹ مار کی زندگی بسر کرنا نہیں تھا بلکہ وہ نجد اور ریاض کے باشندوں کو رشیدیوں کے خلاف اُبھارنا چاہتا تھا ۔ اس سلسلہ میں ابن سعود کو کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ کچھ دنوں میں اس کی پونجی ختم ہو گئی اور بدویوں نے ساتھ چھوڑ دیا رشید نے اس کے تعاقب میں اپنی فوج روانہ کی ' ایک طرف سے ترکوں نے دبانا شروع کیا ۔ دوسری طرف سے عجمانی ٹوٹ پڑے اور عبدالرحمٰن نے بھی لکھ بھیجا ۔

"ہم تمہارے لیے بے چین ہیں اور تمہیں کو بیت آنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ وقت مناسب نہیں ہے۔"

ان حالات نے ابن سعود کو سخت پریشان کر دیا۔ دوسرا کوئی کم ہمت ہوتا تو اس کے چھکے چھوٹ جاتے مگر ابن سعود ارادہ کا پکا اور مستقل مزاج تھا۔ جب ابن کے پاس اس نے اپنے کل ساتھیوں کو جمع کر کے سب حالات من وعن ان کے آگے پیش کر دیے اور ان سے صلاح و مشورہ کیا۔ وہ بذاتِ خود لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے کہا کہ جو لوگ ساتھ دینا چاہتے ہیں ٹھہریں اور جو واپس جانا چاہتے ہیں خوشی خوشی جا سکتے ہیں۔ چند آدمی چلے گئے اور اس کے پاس تیس آدمیوں کے علاوہ اور چالیس آدمی اور اُن کے غلام اور جلوی اور اس کا بھائی محمد اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ مختصر جماعت ایک ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھی۔ اس سے وہ پست ہمت نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک دفعہ اس نے اپنے باپ کے پاس کے پیغام سے کہا۔

"جاؤ اور جا کر والدہ سے وہ سب کچھ کہدو جو تم نے دیکھا اور سُنا ہے ان سے یہ بھی کہدو کہ میں کسی حالت میں بھی اپنے ملک کو رشیدیوں کے ہاتھ میں اور خاندان کو اس تباہ اور برباد حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔ ناکامی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے سب کچھ خداوند کریم کے ہاتھ میں ہے۔"

اس کو اپنے خدا اور اپنے ضمیر کی آواز پہ کافی بھروسہ تھا!!

اب ابن سعود میں پہلے کا سا وحشیانہ پن نہ تھا بلکہ وہ دن بدن سنجیدہ ہوتا جارہا تھا۔ بہت غور سے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوٹ مار فضول ہے۔ مٹھی بھر آدمی نہ تو بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں ایسی صورت میں اس نے یہ مناسب خیال کیا کہ کوئی ایسی عجیب وغریب حرکت کی جائے کہ تمام لوگ اس سے چونک پڑیں۔ فوراً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے اپنے جاسوس ریاض کی طرف روانہ کر دیے۔ جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ریاض میں کافی فوج ہے وہاں کا عامل ایک شمری شیخ 'عجلان ہے جو قلعہ کے سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔ ریاض اور سارے نجد کے لوگ غیر مطمئن ہیں رشیدیوں سے انہیں سخت نفرت ہے اور پھر سے وہ سعودی حکومت کے خواہاں ہیں لیکن انہیں صرف ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ یہ حالات بلاشبہ ابن سعود کی تائید میں تھے۔ لیکن معدودے چند آدمیوں کو لیکر ریاض پر حملہ کرنا جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا تھا اس وقت اس نے یہ ایک تجویز پیش کی کہ اگر ہم لوگ پچاس دن تک خاموشی سے بیٹھے رہیں تو مخالفین یہ سمجھیں گے کہ ابن سعود تباہ و برباد ہو گیا اس کے ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہوگا۔ مگر یہ تجویز اس کے ساتھیوں کو پسند نہ آئی وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے بے چین تھے۔ جنگ کے بغیر ایسی خاموش زندگی انہیں قطعاً پسند نہ تھی۔ بریں ہم ابن سعود نے

انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ یہ گروہ اب نہایت ہوشیاری کے ساتھ ریگستانوں میں چھپا ہوا زندگی بسر کر رہا تھا۔ کھجوروں اور ریگستانی چشموں کے غلیظ پانی پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ یہ دن بڑی بے چینی اور الجھن میں گزرے۔ خدا خدا کر کے رمضان کا مہینہ آپہنچا اور ابن سعود جلوی اور ان کے دوسرے اکثر ساتھی پابندی سے روزے رکھنے لگے۔ بیسویں رمضان کو افطار کے بعد ابن سعود نے کوچ کا حکم دیا۔ آخری مہینہ تھا اور راتیں تاریک۔ اسی لیے یہ قافلہ لوگوں کی آنکھ بچا کر رات میں سفر کرتا اور دن میں قیام کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سفر بڑی سستی کے ساتھ طے ہو رہا تھا اونٹ بھی لاغر اور بے دم ہو چکے تھے اور کھانے کو بھی پاس کچھ نہ تھا۔ الغرض ابو جیفان کے چشموں کے پاس اس خانہ بدوش قافلہ کی عید ہوئی۔ عید کرنے کے بعد یہ لوگ طویق کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتے ہوئے دل الشئی کے نخلستان کے پاس پہنچے یہاں سے ریاض پیدل ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ اس مقام پر اس نے بیس آدمی اونٹوں کے ساتھ چھوڑ دیے اور کہا

"میں ریاض جا رہا ہوں جب تمہیں بلاؤں فوراً آجانا اور اگر نہ آسکو تو کویت واپس جا کر اطلاع دیدینا کہ میں یا تو مر چکا ہوں یا رشیدیوں کی قید میں ہوں"

اس کے بعد ابن سعود اللہ کا نام لیکر کھجور کے درختوں کے سایے تلے سے ہوتا ہوا ریاض کی طرف چلا۔ شمسئی کے مقام پر پہنچنے کے بعد اس نے

کھجور کے ایک درخت کو کاٹ کر سیڑھی بنائی اور جلوی اور چھ آدمیوں کو لیکر باقی کو محمد کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا ۔ اور کہا

"دیکھو اگر کل تک تمہیں ہماری کچھ خبر نہ ملے تو فوراً گھر کا رُخ کرو ۔ اور سمجھ لو کہ ہمارا خاتمہ ہو چکا ہے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔"

(۷)

جلوی اور اپنے چھ آدمیوں کو لے کر ابن سعود لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچا اور ایک مقام پر موقع پا کر سیڑھی کے ذریعہ شہر میں داخل ہوا ۔ یہ وسط جنوری کا مہینہ تھا ۔ سرد ہوائیں کثرت کے ساتھ چل رہی تھیں اس لیے اہل شہر اپنے اپنے گرم بستروں پر آرام کی نیند سو رہے تھے ۔ یہ چند آدمی اپنے ہتھیاروں کو کپڑوں میں چھپا کر خالی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے جواسیر چرواہے کے مکان پر پہنچے جو عامل ریاض کے مکان کے قریب رہتا تھا ۔ ابن سعود دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ایک عورت نے پوچھا " کون ہے ؟ " ابن سعود نے جواب دیا ۔ " میں عامل کے پاس سے آیا ہوں جواسیر سے دو گائیں خریدنی ہیں " عورت نے ڈانٹ کر کہا " چلے جاؤ تم ہمیں کوئی بازاری عورتیں سمجھتے ہو ؟ نکل جاؤ ۔ اتنے وقت گئے جب کہ گھر میں مرد نہ ہوں دروازہ کھٹکھٹانا ٹھیک نہیں ۔ "

" اگر تم نے دروازہ نہیں کھولا تو میں عامل صاحب سے کہدونگا اور پھر کل وہ جواسیر کی خبر لینگے ۔ " یہ کہکر وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ باز وہٹ گیا ۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی اندر سے نکلا۔ ابن سعود کے آدمیوں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور فوراً اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اور سب کے سب دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گئے۔ یہ شخص پہلے محل کا ملازم تھا۔ جیسے ہی اس نے ابن سعود کو دیکھا چلّا اٹھا" ارے یہ تو ہمارے آقا عبدالعزیز ہیں"۔ یہ سنکر گھر کے سب لوگ اس کے اطراف جمع ہو کر ادب سے سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ یہ ملازم بہت سی اہم باتوں سے واقف تھا۔ اس نے بیان کیا کہ قلعہ میں رشید کے سپاہی موجود ہیں نہیں کسی حملہ کی توقع ہے اور نہ وہ اس کی مدافعت کے لیے تیار ہیں۔ حاکم بالعموم قلعہ میں سوتا ہے۔ دن نکلنے کے بعد وہ گھوڑوں کا معائنہ کرتے ہوئے کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر اپنے مکان آتا ہے۔ محافظ دستہ کے بغیر وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اس کا گھر جوا سیر کے مکان سے ایک مکان بعد کو تھا۔ اس پر کوئی پہرہ نہ تھا۔

ابن سعود نے مکان کی چھت پر چڑھ کر عجلان کے مکان کا رُخ کیا اور بازو والے مکان میں داخل ہوا۔ مالک مکان اور اس کی بیوی دونوں محوِ خواب تھے۔ اس کے آدمیوں نے انہیں اس طرح باندھ دیا کہ وہ آواز نہ کر سکیں۔ عامل کا مکان بازو ہی تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اس لیے ابن سعود کے ساتھی ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے اور کچھ دیر کے لیے خاموش لیٹ گئے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ کوئی ان کی نقل وحرکت کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ جب انہیں

ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے وہ مکان میں داخل ہوئے۔ چند آدمی دالان میں سو رہے تھے انہوں نے پھرتی سے انہیں باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور باقی آدمیوں کو چھوڑ کر ابن سعود اور جلوی عامل کی خوابگاہ میں پہنچے۔ یہاں دو عورتیں تھیں۔ ایک تو عامل کی بیوی اور دوسری اس کی بہن، یہ دونوں انہیں دیکھ کر سہم گئیں ابن سعود نے عامل کی بیوی مطلبہ کو پہچان لیا کیونکہ یہ محل کے ایک ملازم کی لڑکی تھی۔ ابن سعود نے بڑھکر مطلبہ کے اور جلوی نے عامل کی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور ابن سعود نے کہا

"مطلبہ خاموش رہ ورنہ میں تجھے مار ڈالونگا تو بڑی بدذات ہے کیونکہ تو نے ایک شامری سے شادی کی ہے۔"

مطلبہ نے سسکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"سرکار میں بدذات نہیں ہوں جب آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا تب میں نے شادی کرلی۔ فرمائیے آپ کا یہاں آنا کیسے ہوا؟"

"میں عجلان کو قتل کرنے آیا ہوں۔"

"عجلان قلعہ میں ہے اور اس کے ساتھ کم از کم اسی آدمی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس سے قبل کہ وہ آپ کو دیکھکر قتل کر ڈالے، آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"وہ مکان کب واپس آتا ہے۔"

"صبح ہونے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد۔"

"اچھا تو تم لوگ اب خاموش رہو اگر ذرا بھی آواز نکلی تو گلا گھونٹ دونگا۔"
یہ کہکر ان عورتوں کو ملازمین کے ساتھ بند کر دیا۔ اَب دن نکلنے میں صرف چار گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ابن سعود بازو کے کمرے میں آیا۔ اس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ قلعہ کی فصیل اور اس کا مضبوط دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فصیل پر ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ اور چوطرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ابن سعود اپنے دو آدمیوں کو محمد اور اس کے ساتھیوں کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ آدمی بہت جلد آ گئے۔ ابن سعود نے مکان کی کھڑکیوں پر پہرے لگا دیے۔ اب ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزر رہی تھی۔ بالآخر سبھوں نے فجر کی نماز ادا کی اور مسلح ہو کر آفتاب کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

(۸)

سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ابن سعود کے ایک آدمی نے جو کھڑکی پر پہرہ دے رہا تھا آواز دی۔ ابن سعود کھڑکی کی طرف گیا۔ سامنے کے میدان میں غلام گھوڑوں کو لیے جا رہے تھے اور قلعہ کے اندر ہل چل شروع ہو گئی تھی۔ ابن سعود نے آخری احکامات دیدیے اور چار آدمیوں کو کھڑکیوں پر متعین کر کے تاکید کی کہ جیسے ہی عجلان قلعہ سے باہر نکلے بندوقیں چلائی جائیں۔ اتنے میں قلعہ کا دوہرا پھاٹک کھلا اور عجلان اپنے محافظ دستہ کے ساتھ قلعہ کے باہر آیا۔ ادھر ابن سعود اپنے

آدمیوں کو ساتھ لے کر شیر کی طرح گرجتا ہوا عجلان کی طرف جھپٹا۔ عجلان نے بھی تلوار کھینچ لی۔ اور ابن سعود پر وار کیا۔ ابن سعود نے اس وار کو اپنی بندوق پر روک لیا اور دونوں گتھ پڑے اور لڑتے لڑتے زمین پر گر گئے یہ حال دیکھ کر محافظ دستہ کے سپاہی تتر بتر ہو گئے اور قلعہ کی طرف بھاگنے لگے۔ ان میں سے ایک سپاہی نے ابن سعود پر وار کیا لیکن جلوی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے نہ صرف وار روکا بلکہ ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ عجلان بڑی ہمت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ لیکن کب تک؟ طاقت جواب دینے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ قلعہ کی طرف بھاگ نکلے لیکن ابن سعود نے بندوق چلائی جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اندر سے قلعہ کے سپاہی دوڑتے ہوئے آئے ادھر سے ابن سعود کے آدمی آگھسے اور قلعہ کی پھاٹک کے پاس یہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک تہلکہ مچ گیا فصیل پر سے سپاہیوں نے گولیاں چلائیں اور پتھر برسانے لگے۔ ابن سعود کے بازو جو ایک آدمی تھا اُسے ایک گولی لگی اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ ایک اور سپاہی بھی زخمی ہوا۔ اب عجلان کے سپاہی ابن سعود کے مقابل تھے اور یہ برابر ان کے حملوں کو روک کر ان پر وار کیے جا رہا تھا۔ اسی طرح لڑتے لڑتے وہ عجلان سے قریب ہوا۔ عجلان نے لیٹے لیٹے ابن سعود کو ایک لات ماری جس سے اُسے سخت چوٹ آئی۔ سپاہی قلعہ کا پھاٹک بند کرنا چاہتے تھے لیکن جلوی اپنے تین آدمیوں کے ساتھ انہیں برابر

روک رہا تھا۔ اسی اثنا میں عجلان نے مسجد کا رخ کیا لیکن جلوی نے مسجد کی سیڑھیوں پر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

عجلان کے قتل کے بعد ابن سعود اپنے آدمیوں کو لے کر قلعہ میں گھسا، کچھ آدمی فصیل پر چڑھ گئے اور کچھ شہر میں جا کر ابن سعود کی فتح کا اعلان کرنے لگے۔ اہلِ ریاض خواب سے بیدار ہوئے۔ وہ پہلے ہی سے رشیدیوں کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ انہوں نے سعودی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ اب ابن سعود ریاض کا حاکم تھا!

چوتھا باب
رشیدیوں کی شکست

۱

ابن سعود کی یہ درخشاں کامیابی تھی۔ مٹھی بھر آدمیوں سے نجد کے ایک ممتاز شہر کو فتح کرنا، واقعی قابلِ تعریف اور جوانمردی کا کام تھا!

ابن سعود اب ریاض کا حاکم تھا لیکن اس سے کیا ہوتا؟ نجد کے قبائل کا اتحاد ضروری تھا۔ ایسی اتفاقی فتح سے اہلِ ریاض مطمئن نہ تھے۔ یہ ان کا بارہا کا تجربہ تھا کہ آج ایک گاؤں یا شہر فتح ہوا اور پھر دوسرے روز ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے علاوہ گذشتہ سالوں سے سعودیوں کو رشیدیوں کے مقابلہ میں مسلسل شکست ہو رہی تھی، پھر کس طرح نجد کے باشندوں کو ایک ناتجربہ کار نوجوان کی اس اتفاقی فتح سے اطمینان حاصل ہو سکتا تھا؟ نجدی قبائل نے سعودیوں کی طرف داری کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ البتہ

اہلِ ریاض اور دوسرے سو آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ بھلا اتنی قلیل تعداد شامریوں کی باقاعدہ فوج کے ساتھ کیا مقابلہ کرسکتی ؟

بہرحال آگے چل کر خواہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھے، اس وقت تو ابن سعود ریاض کا حاکم تھا اور اہلِ ریاض اس کے ہم نوا تھے۔ قلعہ کی دیوار شکستہ ہوگئی تھی، انہوں نے دن رات کی محنت سے اسے تعمیر کردیا۔ برج بنائے، خندق کھودی، رسد بہم پہنچائی اور رشیدی حکومت کے زمانہ میں جو آلات حرب زمین میں دفن تھے انہیں نکال لیا۔ ابن سعود اب حملہ کی مدافعت کے لیے تھوڑا بہت تیار تھا۔ اس اثنار میں اس نے ایک فوجی دستہ بھی تیار کرلیا۔

ان باتوں کی اطلاع جب رشید کو ملی تو وہ بہت برہم ہوا اور کہنے لگا "یہ غریب بے وقوف، یہ تو ایک پرندہ ہے جو جال میں پھنس گیا"۔ اس وقت رشید دوسرے اہم کاموں میں مصروف تھا۔ اس کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ کام سے فارغ ہوکر وہ اس کی خبر لینا چاہتا تھا۔

ابن سعود گو نپولین کی طرح جنگی چالوں سے واقف نہ تھا۔ تاہم اس میں فوجی ذکاوت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدیوں کی اتنی بڑی فوج کے مقابلہ میں اس طرح قلعہ بند رہنا قرین مصلحت نہیں تاوقتیکہ باہر نکل کر کچھ ہلچل نہ کی جائے مقابلہ یا کامیابی خام خیالی ہے۔ اس نے فوراً اپنے والد کو ریاض کی فتح کی اطلاع بھیجی اور ریاض

آنے کی درخواست کی کیونکہ ریاض کی مدافعت کے لیے وہ اپنے باپ سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

عبدالرحمن اپنے دوسرے لڑکے عبداللہ کو ساتھ لے کر کویت سے نکلا اور احسا، سے ہوتے ہوئے ریاض کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے ممکنہ حفاظتی تدابیر کے ساتھ اپنے سفر کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ بالآخر چھپتے چھپاتے ریگستان دہنہ کے غیر آباد علاقوں سے ہوتا ہوا وہ بصد ہزار مشکل خیر و عافیت سے ریاض پہنچا۔

ریاض کے باشندوں نے عبدالرحمن کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنا حاکم تسلیم کیا۔ تھوڑے دن بعد عبدالرحمن نے ریاض کے علما، اور شرفا، کو جمع کر کے ابن سعود کو اپنا جانشین قرار دیا اور سعود اعظم کی تلوار دی جو پشت ہا پشت سے باپ سے بیٹے کو ورثۃً چلی آ رہی تھی۔ یہ تلوار بڑی نفیس اور عمدہ ہے اس کا پھل دمشقی فولاد اور قبضہ سونے کا ہے، نیام پر چاندی کا کام ہے۔

ابتدا ہی سے عبدالرحمن باعمل، جنگجو اور بہادر تھا۔ باوجود بڑھاپے کے اس میں اب بھی وہی پہلے کی سی آن بان تھی لیکن اب اس پر مذہبیت کا رنگ بہت غالب آ چکا تھا۔ زیادہ تر وقت قرآن اور حدیث کے مطالعہ میں صرف کرتا اور اکثر اذکار و اشغال میں مصروف رہتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو ہر وقت نصیحت کرتا اور انہیں مفید مشورے دیا کرتا تھا۔ لیکن مہمات میں ان کی رہبری سے مجبور تھا۔ کیونکہ یہ عمر

جنگ وجدال کے لیے موزوں نہ تھی۔

ابن سعود باپ کا حد سے زیادہ احترام کرتا اُس کی نصیحتوں کو کان لگا کر سنتا اور ضرورت کے وقت ان پر عمل کرتا تھا'

(۲)

ریاض پر اب ابن سعود کی حکومت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بہت جلد نجد پر اور پھر سارے عرب پر قبضہ کر لے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس نے مدافعت کے لیے انتظامات شروع کر دیے اور جب اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ شہر میں بیرونی حملوں کو روکنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے تب مدافعت کے سارے انتظامات اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ذمہ کر دیے اور خود منتخبہ فوج لے کر سو اونٹ اور چالیس گھوڑوں کے ساتھ اپنے بھائی سعد کے ہمراہ باہر نکلا۔ سعد' ابن سعود کا سب سے زیادہ چہیتا بھائی تھا' اس کی جسمانی بناوٹ اور خیالات ابن سعود سے ملتے جلتے تھے ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ البتہ سعد میں قوتِ فیصلہ اور خود ضبطی کی کمی تھی۔

ریاض کو مرکز قرار دیکر وہ نجد کے جنوب میں افلاج اور حارج کے علاقوں میں پہنچا' کہ یہاں سے امداد لے۔ یہاں کے شیوخ قبیلہ دواسر سے تھے جو اس کی ماں کے رشتہ دار ہوتے تھے' لازماً وہ اس کا ساتھ دیتے۔ اس کے علاوہ ابن سعود کی نظر ان لوگوں پر اس لیے بھی پڑی کہ یہ لوگ دلیر' بہادر اور رشیدیوں کے جانی دشمن تھے۔ اس کے مقصد کیلئے

یہ لوگ حد درجہ موزوں تھے۔

رشیدیوں کے سپاہی اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ لیکن اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ ابن سعود اب بڑی ہمت اور تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر کوئی قبیلہ اس کے خلاف سر اٹھاتا تو فوراً سے وہ کوئی موقع تلاش کر کے ایسے وقت میں ان پر حملہ کرتا جب کہ وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں۔ ہمیشہ اسے کامیابی ہوتی گئی، جس سے فوجیوں کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور وہ اس سے ڈرنے لگے۔ دن بدن اس کی بہادری افسانہ بنتی گئی۔ چھ آدمیوں سے ریاض پر قبضہ حاصل کرنا بظاہر افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ عرب کے اطراف و اکناف میں اس کی بہادری کا چرچا ہونے لگا اور اس کی شخصیت مسلم ہوتی گئی۔ تلوار کی لڑائی تو اس کے نزدیک بچوں کا کھیل تھا۔ فاصلے بھی وہ اسی سرعت کیساتھ طے کرتا اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک ہی وقت میں وہ دو مقاموں پر موجود رہے۔

ابن سعود کے متعلق رشید کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ اسے ایک معمولی آدمی سمجھتا تھا اور ریاض کے واقعہ کو محض اتفاق پر محمول کرتا تھا۔ لیکن جب اس کی بہادری کی مزید خبریں اس کے کان تک پہنچیں تو وہ چونک پڑا اور اس کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ رشید بذات خود بہت بہادر سپاہی تھا۔ البتہ اس میں حکومت کا مادّہ کم تھا۔ بہر حال شمری قبائل کو ساتھ لیکر وہ ریاض کی طرف روانہ ہوا اور جب قریب پہنچا تو

اطلاع ملی کہ شہر اس وقت اچھی طرح سے محفوظ و محصور ہے' اس کے مشیروں نے صلاح دی کہ اطراف کی باؤلیوں پر قبضہ کر کے پانی کی رسد بند کر دی جائے لیکن رشید محاصرہ کا موافق نہ تھا' وہ فوری حملہ کر کے لوگوں کے دلوں پر اپنی بہادری کا سکہ جمانا چاہتا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ابن سعود جنوب کی طرف روانہ ہوا تو اس نے بھی جنوب ہی کا رُخ کیا۔

ابن سعود جنوب میں بہت دُور نکل چکا تھا۔ اس اثنا میں وہ مختلف قبائل کے شیوخ سے ملا۔ ان سے اتحاد و دوستی کی درخواست کی' بعضوں نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور اکثر و بیشتر قبائل نے شمری جنگجوؤں کے خوف سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن ابن سعود آہستہ آہستہ ان کے دلوں سے خوف دُور کرتا گیا اور ان کے جوش کی آگ کو بھڑکانے لگا۔ وہ اب اپنے مقصد کے پیچھے ہمہ تن منہمک تھا' بہت کم سوتا اور بہت کم کھاتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اہل قبائل اور شیوخ سے ملنے' ان سے مباحثہ کرنے اور انہیں سمجھانے منانے میں گزرتا تھا۔ یہ بڑا صبر آزما کام تھا۔ لیکن ابن سعود کا یہ مستحکم ارادہ اور مستقل مزاجی ہی تھی کہ وہ اس سے بیزار نہیں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے اندر اس کے پاس ایک ہزار آدمیوں کی ایک فوج تیار ہو گئی۔ اب وہ حوطہ میں تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ایک تیز رو سوار نے آکر اطلاع دی کہ رشید نعجان میں ہے اور الدلم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔

اب وقت ضائع کرنا فضول تھا' حوطہ سے الدم ۰۰ میل پر تھا' ابن سعود چاہتا تھا کہ اپنی فوج کے ساتھ صبح ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اس کے لیے یہ غیر ممکن نہ تھا' وہ تو اس سے بھی جلد پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اگر یہ سیدھا نعجان کا رخ کرتا تو ممکن تھا کہ جاسوس رشیدی فوج کو اطلاع دیدیتے اس لیے اس نے انہیں مغالطہ دینے کے لیے اعلان کر دیا کہ وہ مغرب کی طرف کوچ کر رہا ہے' اس کے بعد وہ مغرب کی طرف تھوڑی دُور گیا اور پھر طویق کی پہاڑیوں سے ہوتا ہوا شمال کی طرف چلا۔

ابن سعود اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نہایت سرعت سے سفر کر رہا تھا راستہ میں اسے بڑی دشواری ہوئی۔ سوار اور اونٹ دونوں بے دم ہو گئے تھے ایک دفعہ تو ابن سعود اونٹ سے گر کر نیچے دب گیا۔ ساتھیوں نے اسے پھرتی سے نکال لیا تاہم کافی صدمہ پہنچا لیکن وہ ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سخت تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود' وہ برابر اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا بالآخر دن نکلنے سے بہت پہلے وہ الدم پہنچ گیا۔

اہل الدم پہلے ہی سے اس کے ساتھ ہو چکے تھے اس لیے ان کو بچانا ابن سعود کا فرض تھا۔ اگر وہ انہیں امداد نہ دیتا تو پھر دوسروں پر سے اس کا اعتماد اُٹھ جاتا۔ بہرحال وہ وقت پر پہنچ گیا۔ شہر میں داخل ہو کر سب دروازے بند کرائے' فصیل پر آدمی چڑھوائے

اور چوطرف پہرے مقرر کرا دیے ۔ منجان کے شمال میں کھجوروں کے بن میں بھی کچھ آدمی بھیج دیے ۔ اس کے بعد اس میں سکت نام کو نہ رہی ۔ وہ بے ہوش ہو گیا ۔ گذشتہ سات روز سے اسے نام کو آرام نہیں ملا تھا' وہ اب بالکل بے دم تھا ۔ ساتھیوں نے اسے اٹھا کر آرام سے لٹایا ۔ تیل کی مالش کی اور لحاف اڑھا دی ۔ دوسرے دن ظہر کی نماز کے وقت جب وہ اٹھا تو اس کا سارا جسم اکڑا ہوا تھا ۔ لیکن اب اس میں کسی قدر تازگی آ گئی تھی ۔

(۳)

اسی دن رشید نے اپنی خاص فوج کا ایک دستہ ولام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا ۔ جیسے ہی یہ دستہ کھجوروں کے درختوں کے قریب پہنچا ابن سعود کے سپاہیوں نے گولیاں چلانی شروع کر دیں ۔ چھ آدمی اور چار گھوڑے مارے گئے ۔ یہ حال دیکھ کر دستہ کے دوسرے سپاہی واپس لوٹے ۔ رشید نے اور آدمی روانہ کیے' وہ سمجھ گیا کہ کوئی بڑی فوج اس کے مقابل ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ اسے نہ ہو سکا کیونکہ ابن سعود نے اپنے سپاہی کھجوروں کے درختوں میں منتشر کر دیے تھے ۔ اور شہر میں تو کافی آدمی موجود تھے ۔

ابن سعود جب دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھا تو اسے نعرہ جنگ سنائی دیا ۔ رشید اپنی فوج کے ساتھ شہر کی طرف آ رہا تھا ۔ وسط میں پیادہ فوج تھی اور اطراف میں سوار تھے ۔ سب کے ہاتھوں میں

برہنہ تلواریں تھیں اور سب رشیدی جھنڈے کے سایہ میں جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ابن سعود کے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ وہ اطمینان سے خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہمراہی جنگ کے لیے تُلے ہوئے لیکن اس نے انہیں عجلت سے روکا اور جب دشمن کی فوج بہت قریب پہنچی تو اس نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ فوج کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے۔ رشیدیوں نے کبھی بھی ابن سعود کی طرف سے اس قسم کی باقاعدہ اور منظم مدافعت کی توقع نہیں کی تھی۔ اتنے میں ابن سعود نعرۂ جنگ بلند کرتا ہوا دشمن کی فوج پر جھپٹا۔ فوجی بھاگنے لگے۔ ابن سعود نے ان کا تعاقب کیا اور رشید پوری طرح سے شکست کھاکر ریاض کی طرف بھاگ گیا۔

یہ خبر بجلی کی طرح سارے نجد میں پھیل گئی۔ برابر ایک صدی سے سعودی رشیدیوں کے مقابلہ میں پسپا ہو رہے تھے۔ لیکن بالآخر سعودیوں نے رشیدیوں کو نیچا دکھایا۔ حارج اور افلاج کے لوگ اس کے ساتھ ہو گئے اور نجد کے جنوبی علاقہ نے اس کا ساتھ دیا۔

رشید نے اس جنگ میں شکست تو کھائی مگر وہ ایسا کم ہمت نہ تھا جو خاموش رہ جاتا۔ اس کی بلند حوصلگی اور عزت پر یہ ایک بڑا دھبّہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تاخیر نقصان دہ ہے۔ اگر ذری سی بھی غفلت ہوئی تو ابن سعود کی قوت بڑھ جائیگی۔ اس لیے حائل پہنچتے ہی اس نے ایک نئی فوج جمع کر کے کویت کا رُخ کیا۔ مبارک نے ابن سعود کو

امداد کے لیے طلب کیا اور وہ فوراً کویت کی طرف روانہ ہوا۔ رشید بھی یہی چاہتا تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی کہ وہ اس کے مقابلہ کے لیے کویت کی طرف آیا ہے، خود کویت کو چھوڑ کر ریاض کی طرف چل نکلا تاکہ ابن سعود کی عدم موجودگی میں ریاض پر قبضہ کر لے۔ لیکن یہاں عبد الرحمن ہر طرح سے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے باہر ہی سے رشیدیوں کو چلا دیا۔ جیسے ہی ابن سعود کو یہ اطلاع ملی کہ رشیدی ریاض کی طرف گئے ہیں تو خود اس نے ریاض کا رخ نہیں کیا بلکہ مغرب کی طرف روانہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ریاض پر انہیں شکست ہوگی اور جب وہ وہاں سے بھاگیں گے تو ٹھیک اسی طرف کو نکل آئیں گے۔ اور ہوا یہی۔ ریاض سے رشیدی اسی راستہ تو لٹے۔ شمری اب بہت تھک گئے تھے، بال بچوں کی یاد انہیں بہت ستا رہی اور دو مسلسل شکستوں نے ان کی ہمت کو بہت پست کر دیا تھا۔ وہ بکھر گئے اور اپنے گھروں کو جانے لگے۔ اس طرح رشید کی فوج کا خاتمہ ہو گیا۔

ابن سعود کے لیے یہ بہت بہتر موقع تھا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور رشیدیوں کو بھگا کر اطراف واکناف کے گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ اب نجد کے شمال میں ابن سعود کی ۰ میل تک حکومت تھی۔

(۴)

ان کامیابیوں سے ابن سعود کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے اس کا نام سارے عرب میں مشہور ہو گیا۔ اور دُور دُور کے قبائل اس سے آکر ملنے لگے۔ وہ اب نجد کے تقریباً

نصف حصہ پر قابض تھا۔ اور رشید کے مقابلے کے لیے اس کے پاس کافی وسائل مہیا ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے ابتدائی زمانہ تک کچھ نہ کچھ لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کے بعد قحط پڑ گیا جس کی وجہ سے جانبین نے کچھ وقتوں کے لیے سکوت اختیار کیا۔

اب رشید اور ابن سعود کی شخصیتوں کا مقابلہ تھا۔ رشید کے قدم تو پہلے ہی سے جمے ہوئے تھے۔ لیکن ابن سعود کے پاس بھی اب کافی قوت جمع ہو گئی تھی۔ لیکن دونوں کو بھی کامل اطمینان نصیب نہ تھا کیونکہ قبائل کی حالت کچھ عجیب ناگفتہ بہ تھی۔ آج ایک کا ساتھ دیا اور کل دوسروں کے ہو گئے۔ ایک نے لالچ دیا' اس کے دوست بن گئے اور پھر کل ذرا سی شکست ہوئی' انجان ہو گئے بلکہ موقع ملے تو خود اسی پر حملہ کر بیٹھے۔ بالخصوص عجمانیوں کی دغاباز فطرت ناقابل اعتماد تھی۔ اور جانبین کو ان سے خدشہ لگا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں کسی کو کیسے اطمینان حاصل ہو سکتا؟ بہرحال اب سوال دو شخصیتوں کا تھا اور حالات کا اطمینان بخش ہونا انہی کے فیصلہ پر منحصر تھا۔

رشید پستہ قد' سیاہ فام اور چھچھورا سا آدمی تھا۔ کنجوس اور ترش مزاج بھی تھا۔ قبائل پر حکومت کرنے کی اس میں بہت کم صلاحیت موجود تھی۔ وہ لوٹ مار کر کے دولت حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار بالکل اس کی فوج پر تھا۔ اگر فوج میں بددلی پیدا ہو جائے تو اس کو سنبھالنے سے وہ مجبور تھا۔

برخلاف اس کے ابن سعود فیاض دل اور مستقل مزاج انسان تھا۔ اس میں صبر کا کافی مادہ تھا۔ قبائل کو سنبھالنے کی بھی اس میں کافی صلاحیت موجود تھی۔ وہ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے انہیں بڑے بڑے کاموں کے لیے اکساتا تھا۔ اس میں فیاضی، شجاعت اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، یہ خصوصیات عربوں کی پسندیدہ تھیں۔ ابن سعود گو وہابی تھا لیکن وہابیوں کی طرح خشک مزاج نہیں۔ وہ اکثر ہنستا، بولتا بھی تھا۔ یہ جوان اور مذہبی آدمی تھا، برخلاف اس کے رشید اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ ابن سعود، تباہی اور بربادی کے لیے نہیں بلکہ حکومت اور اقتدار کے لیے لڑنا چاہتا تھا اور رعایا کے دلوں کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا تھا۔ یہ خصوصیات اس کی زندگی کو کامیاب بنانے میں مفید ثابت ہوئیں۔

۱۹۰۳ء میں بارش ہوئی اور قحط دور ہو گیا تو ابن سعود شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے اور شمر کے درمیان قدیم نجد کا مالدار شہر قصیم واقع تھا۔ غنیزہ اور بریدہ اس کے مخصوص علاقے تھے۔ ان پر گو رشیدیوں کی حکومت تھی تاہم یہاں کے باشندے ابن سعود کے حامی اور طرفدار تھے۔

ابن سعود بہت جلد قصیم پہنچ گیا۔ یہاں کچھ ایسی زیادہ دقت پیش نہیں آئی، پہلے ہی سے اہلِ قصیم اس کے موافق اور رشید کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس نے بہت آسانی سے وہاں کے حاکم حسین جراد کو قتل کر کے غنیزہ پر قبضہ کیا اور پھر شہر بریدہ کا محاصرہ کر لیا۔ رشید نے بریدہ کی

فوج کی رہائی کے لیے اپنے چچیرے بھائی عبید کی سرکردگی میں فوج روانہ کی۔ ابن سعود نے فوراً اس فوج پر حملہ کر دیا، سخت لڑائی کے بعد رشیدیوں کو شکست ہوئی شمری قبائل منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے اور عبید گرفتار کر لیا گیا۔

جب عبید، ابن سعود کے سامنے لایا گیا تو وہ اپنے عرب گھوڑے پر سوار تھا، پوچھنے لگا۔

"اچھا یہ عبید ابن رشید ہے، لیکن کس نے میرے چچا محمد کو ریاض میں قتل کیا تھا؟"

یہ کہکر ابن سعود گھوڑے پر سے اتر پڑا اور والد کی دی ہوئی تلوار کو میان سے باہر نکال کر تولنے لگا۔

عبیدہ نے کہا "اے ابو ترکی، مجھے قتل نہ کر۔"

ابن سعود نے جواب دیا "یہ رحم کا مقام نہیں ہے، میں انصاف چاہتا ہوں، قتل کا انتقام۔"

یہ کہکر اس نے عبید پر اپنی تلوار سے تین ہاتھ مارے۔ فوارے کی طرح جسم سے خون اڑنے لگا، عبید کا دل باہر نکل آیا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

ابن سعود نے اپنی تلوار کو بوسہ دیا۔ پھر اُسے کو صاف کیا اور اُسے میان میں رکھ لیا۔

جب بریدہ کی فوج کو رہائی کی اب کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے ابن سعود کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، شمر تک کا تمام علاقہ ابن سعود کے

قبضہ میں آ گیا۔ رشید نجد سے باہر نکال دیا گیا اور پھر سے ایک مرتبہ سارا نجد سعودیوں کے قبضہ میں آگیا ۔

اس درخشاں کامیابی کے بعد جب وہ ریاض واپس ہوا تو اکثر کٹّے وہابی تک اس سے ملنے اور مبارکباد دینے کے لیے آئے ۔ بڑے بزرگوں، مذہبی پیشواؤں، حاکموں اور مختلف قبائل کے شیوخ کی خواہش کے مطابق سب لوگ ریاض کی جامع مسجد میں جمع ہوئے اور ظہر کی نماز کے بعد عبدالرحمٰن نے ابن سعود کو

نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام

قرار دیا۔

پانچواں باب

رشید کا انجام

(۱)

ابن سعود کی اس مہتم بالشان کامیابی نے نہ صرف عرب کے ریگستان میں ایک تہلکہ مچا دیا بلکہ ترک بھی اس سے چونک پڑے۔ وہ عرب کے برائے نام حاکم تھے، ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے لڑانا اور ہمیشہ کمزور کی تائید کر کے زوردار کی قوت گھٹانی ایک عرصہ سے ان کی کامیاب پالیسی رہی تھی۔ جس وقت رشید زور پکڑ رہا تھا، انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور اب وہ ابن سعود کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔

سلطان عبدالحمید خاں کی خواہش تھی کہ پھر سے دولت عثمانی کا احیاء ہو اور وہ پہلے کی طرح سلطان اعظم اور

خلیفہ بن کر وسط عرب پر حکومت کریں۔ جرمن موقع کے منتظر تھے' سلطان کے اس رجحان کو دیکھ کر انہوں نے اپنے مقصد کی تحت انہیں اکسایا' مشرق کی طرف بغداد ریلوے کا پایہ ڈالدیا اور خلیج فارس کی طرف اپنے آدمی اور تاجر بھیجنے لگے۔ غرض انگریزوں کو بے دخل کرنے کے لیے وہ ممکنہ تدابیر اختیار کر رہے تھے' ان کے لیے ابن سعود سخت خطرناک تھا' ایک تو خود وہ اپنا ذاتی اثر رکھتا تھا اور دوسرے وہ انگریزوں کے دوست مبارک کا حلیف اور طرفدار بھی تھا۔ انہوں نے عبدالحمید خاں کو سمجھایا کہ وہ رشید کو ہموار کریں' رشید کی قوت گھٹ رہی تھی' اس نے سلطان کی امداد کو خوشی سے قبول کیا۔ سلطان نے یمن اور حجاز میں مزید فوج روانہ کی اور بغداد اور احسار میں اپنی قوت بڑھالی اور دمشق سے حجاز اور پھر مدینہ تک ریل کی پٹڑی ڈالنے کا حکم دیدیا۔

ابن سعود نے اس موقع پر بھی مداخلت نہیں کی بلکہ خاموش حالات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس اثناء میں ابن سعود کو شکست دینے کے لیے ترکوں نے اور فوج بھیجی' رشید نے ۱۹۰۳ء میں گرما کے ابتدائی زمانہ میں ترکی فوج کے ساتھ نجد کا رُخ کیا' عنیزہ اور بریدہ والوں کو دھمکیاں دیں اور انہیں ابن سعود کی مخالفت کے لیے مجبور کیا۔ ابن سعود بھی اپنے آدمی جمع کرکے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا اور نجاریہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ رشید کے پاس فوج اور دولت کی کمی نہ تھی۔

ابن سعود مقابلۃً مفلس ونادار تھا حتیٰ کہ اس کے پاس کھانے پینے کا انتظام تک نہ تھا۔ چنانچہ بجاریہ میں اس رات فوج نے عملاً فاقہ کیا۔ اس کے ساتھی پست ہمت ہو گئے لیکن ابن سعود نے انہیں دم دلاسا دیا اور کامرانی کا دل خوش کن خواب دکھا کر انہیں جنگ کے لیے آمادہ کرلیا۔

شام کے وقت ابن سعود کے سامنے سے کچھ دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دشمن کی فوج کا گمان ہوا اور اب وہ مدافعت کیلئے تیار ہونے کو تھا کہ جاسوسوں نے آکر اطلاع دی کہ یہ دشمن کی فوج نہیں ہے بلکہ چند ملازم ترکی فوج کے لیے بکرے چرا کر لیجا رہے ہیں۔ یہ سنکر ابن سعود نے فوراً ان کا تعاقب کیا اور ان پر حملہ کرکے اُن آدمیوں سے بکرے چھین لیے۔ یہ دیکھکر رشیدی ابن سعود کی طرف بڑھے، دونوں کا زور دار مقابلہ ہوا۔ لیکن اتنے میں رات ہوگئی جس کی باعث دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کو واپس چلی گئیں۔ آج رات ابن سعود کے ڈیرے میں جشن تھا۔ ایک دن کے فاقہ کے بعد غذا اور پھر گوشت جیسی "سید الطعام" غذا نعمت بالائے نعمت تھی!

دوسرے دن صبح ہونے سے قبل ہی ابن سعود نے رشیدیوں پر حملہ کردیا، شمری فوج پسپا ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔ لیکن ترکی فوج وسط میں ستون کی طرح کھڑی ہوئی شمری قبائل کی ہمت افزائی کررہی تھی لیکن باوجود اس کے ابن سعود کے حملے مسلسل کامیاب

رہے، یہ حال دیکھ کر ترکی فوج نے دن ڈھلنے کے بعد گولہ باری شروع کر دی۔ عربوں نے ایسا دہشت انگیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ بدحواس ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ابن سعود یہ رنگ دیکھ کر خود گولیوں کی بوچھار کے سامنے آگیا۔ اور پرجوش الفاظ میں اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے لگا۔ ایک گولہ بالکل اس کے بازو سے گذر گیا۔ ایک ٹکڑا اس کی انگلی کو لگا اور آدھی انگلی بالکل غائب ہو گئی اور ایک ٹکڑا اس کے گھٹنے کو لگا جس سے بُری طرح وہ زخمی ہوا اور جسم سے خون مسلسل بہنے لگا۔ ابن سعود نے اس درد کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اسی جوش میں نعرہ لگا لگا کر اپنے لوگوں کو جمع کرنے لگا۔ اور جب سب لوگ جمع ہو گئے تو واپس لوٹ گیا۔ اس اثناء میں رشید کے ایک ہزار آدمی مارے گئے، ترک چاہتے تو قصیم اور نجد کے شمالی علاقہ پر قبضہ کر لیتے لیکن دھوپ اس شدت کی تھی کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور ابن سعود کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے خیموں کو سدھارے۔

ابن سعود کا جسم زخموں سے چور تھا، دوسرا کوئی ہوتا تو ہفتوں بستر سے اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مگر آفریں ابن سعود پر کہ انتہائی درد و تکلیف کے باوجود سب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہنس رہا تھا، درد کا نام کو بھی احساس نہ تھا۔ بلکہ کچھ آرام لینے کی بجائے اس نے اپنا کام شروع کر دیا مطیر، عتیبہ، دواسر اور اس سے بھی آگے عنزہ قبائل کے پاس

اس نے قاصد بھیجے۔ شیوخ کو رام کرنا آسان کام نہ تھا۔ وہ اس طرح آسانی سے راضی ہونے والے نہ تھے۔ بہر حال ابن سعود نے انہیں سمجھایا کہ ترک رشیدیوں کو امداد دے رہے ہیں، جرمن ان کی پشت پناہ ہیں اور اگر رشیدیوں کو فتح ہو گئی تو سمجھ لو کہ عرب کی آزادی کا خاتمہ ہے۔

بہر حال تھوڑی بہت قوت جمع کر کے ابن سعود نے رشیدیوں پر حملہ کر دیا۔ ترکی فوج ان کو بچاتی رہی۔ سعودی برابر حملہ کر رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد قبائل مطیر نے جواب دیدیا۔ ابن سعود نے سوچا کہ اگر اب کی دفعہ شکست ہوئی تو بس خاتمہ ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے محافظ دستہ اور دوسرے سپاہیوں کے ساتھ اپنی بہن نورٰی کے نام کا نعرہ لگاتا ہوا ترکی فوج کی طرف لپکا اور اس زور کا حملہ کیا کہ ترکی فوج کے پیر میدان سے اکھڑ گئے۔ یہ حال دیکھکر شمریوں کے دل بھی چھوٹ گئے لیکن ترک پھر سے ایک جگہ جمع ہو گئے مگر ابن سعود کے آدمیوں نے چو طرف سے انہیں گھیر لیا۔ اب تو ترکی فوج بہت ہی منتشر ہو کر بھاگنے لگی۔ ان کے پیر لڑکھڑانے لگے، اکثر تو راستے ہی میں گر گئے۔ بدوی عورتوں نے متعدد ترکی سپاہیوں کے سر اُتار لیے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اور جو بچ رہے وہ افتاں و خیزاں بصد ہزار مشکل بصرہ پہنچے۔

(۲)

اس شکست سے ترکوں کے وقار کو سخت دھکا پہنچا۔ وہ کبھی

خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بدلہ لینا ان کے لیے ناگزیر تھا۔ انہوں نے دریائے فرات کے کنارے ایک زبردست فوج جمع کر لی تاکہ ابن سعود کی فوج پر حملہ کر کے اس کا قلع قمع کر دے۔

سعودی ترکوں کی شاندار پسپائی اور اپنی درخشاں کامیابی پر پھولوں نہیں سما رہے تھے۔ وہابی ملاّ اور ابن سعود کے مشیر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ترکی فوج کو شکست دینا واقعی ایک یادگار کارنامہ تھا! لیکن ابن سعود پر اس فتح کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ حالات کا سرسری نہیں بلکہ گہری نظر سے مطالعہ کرتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ 'فتح' حقیقی معنیٰ میں فتح نہیں ہے۔ کیونکہ ترکوں کی ایک تھوڑی سی فوج کو شکست دینے سے کیا حاصل؟ اگر ترک اپنی زبردست فوج بھیج دیں تو کیا مقابلہ کیا جا سکیگا؟ اب وہ مدافعت کی تدبیریں کرنے لگا اسے صلح ہی بہتر نظر آئی۔ مبارک کے ذریعہ اس نے بصرہ کے گورنر مخلص پاشا کے پاس مصالحت کی تجویز پیش کی، عبدالرحمن نے اس کی طرف سے نمایندگی کی اور یہ طے پایا کہ ترک ابن سعود کو نجد کا حاکم تصور کرینگے اور شہر قصیم پر بھی اس کا قبضہ رہیگا البتہ عنیزہ اور بریدہ میں تھوڑی سی ترک فوج رہیگی۔

اس تصفیہ کے باعث ابن سعود کو ترکوں کے زبردست حملہ سے نجات ملی۔ معاہدہ کے مطابق ترکی فوج عنیزہ اور بریدہ میں آئی۔ یہاں فوجیوں کو بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ ایک تو گرمی دوسرے

اجنبی اور غیر مانوس ماحول اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابن سعود نے ان کو کچھ بھی امداد نہ دی۔ اس کے علاوہ بصرہ سے جو کچھ بھی سامان ان کے لیے آتا وہ راستہ ہی میں کسی نہ کسی طرح سے لوٹ لیا جاتا تھا۔ اس طرح سے ترکی فوج ایک بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"۔ اگر وہ ذرا بھی گڑ بڑ کرتے تو عرب ان کی اچھی طرح سے خبر لے لیتے۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر ترکی فوج کی حالت بڑی خراب و خستہ ہو گئی۔ کھانے کو کھانا نہیں رہا۔ اکثر دفعہ تو ان قسمت کے ماروں نے کھجور کی گٹھلیاں کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی اور اکثروں نے مجبور ہو کر اپنے آلات حرب سستے داموں فروخت کر دیے۔ شہر قصیم کے لوگ ان کے حق میں بڑے بے رحم اور سخت دل ثابت ہوئے۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام "بنت الشیطان" رکھا۔

یہ حالت دیکھ کر ترکی حکومت نے ابن سعود پر دباؤ ڈالا اور اس سے امداد کے لیے کہا۔ اس نے بھی انہیں میٹھا سا جواب دیا لیکن امداد نہ دی۔ اس پر ترک بہت بگڑے۔ ابن سعود نے امداد کے معاوضہ میں ان سے سونا طلب کیا کیونکہ قبائل کو ہموار کرنے کے لیے اسے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ ترکوں نے اس سے انکار کر دیا جس سے ابن سعود بھی انجان ہو گیا۔ فی الوقت ترکوں کا اسے ذرا بھی ڈر نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ترک اس وقت بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حجاز اور یمن میں مسلسل بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ شام میں انقلابی جلسے

ہو رہے تھے کہ ترکوں کو عرب سے نکال کر عرب حکومت قایم کی جائے۔ بلقان، مصر، ترک اور خود قسطنطنیہ میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور ترک ان مخالفتوں کو روکنے میں سرگرداں و پریشان تھے۔ ابن سعود چاہتا تھا کہ ایسے موقع پر اگر ترکی فوج پر حملہ کرکے اسے نکال باہر کردیا جائے تو عرب قبائل میں اس کا وقار بڑھ جائیگا۔ لیکن ابھی وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب موقع کا منتظر تھا کہ خود ترکوں نے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور احسا میں صرف چند فوجی دستے چھوڑ دیے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی وسط عرب کا رخ نہیں کیا۔

(۳)

ترک واقعی ابن سعود کے رستہ کے روڑے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ بہت شیر ہوگیا۔ عربوں نے یہ سمجھا کہ ترک ابن سعود سے ڈرکر بھاگ گئے۔ اب کیا تھا قبائل اور شیوخ اس کے ساتھ تھے اور ہر ایک اتحاد و دوستی کا دم بھر رہا تھا۔ لیکن ابن سعود نے دُور اندیشی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ جب تک رشید زندہ ہے، وہ کبھی چین سے بیٹھ نہیں سکتا۔ عرب کی حالت بڑی عجیب تھی۔ ذری سی چوک بھی تختہ اُلٹ دینے کے لیے کافی تھی۔ بیرونی حملوں کے ساتھ ساتھ ابن سعود کو خود اپنے والوں پر بھی اعتماد نہ تھا۔ اگر اس سے ذری بھی لغزش ہوجاتی تو خود اس کے ساتھی اس کو موت کے گھاٹ اتارنے میں

ذری بھی تاخیر نہ کرتے۔ اسی لیے وہ ہر معاملہ میں حد درجہ محتاط تھا۔
محافظ دستہ اس کے خیمہ کی حفاظت کرتا تھا۔ راتوں کو وہ بہت کم سوتا
تھا۔ جنگ اور سفر میں اس نے کبھی بھی اپنے ساتھ پلنگ نہیں رکھا بلکہ
ریت پر کپڑا بچھا کر سو رہتا تھا۔ ہمیشہ اس کے بازو برہنہ تلوار رہتی تھی۔
اور بعض دفعہ تو وہ تلوار پر سر ٹیک کر کھڑا کھڑا سو جاتا تھا اور جب
جاگتا تو ایک پل میں پینترا کاٹ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے
خیمہ میں کسی کو بلا اجازت داخلہ کی ممانعت تھی۔ ایک دفعہ اس کا
ملازم بلا اطلاع اندر داخل ہو گیا۔ ابن سعود سو رہا تھا۔ آہٹ پا کر
وہ اٹھ بیٹھا اور ابھی ملازم کی زبان سے ایک لفظ بھی برابر نہ نکلا تھا
کہ اس کا ہاتھ شانہ سے جُدا ہو گیا۔ ابن سعود کا گھوڑا بھی ہمیشہ خیمہ
کے بازو بندھا رہتا تھا۔ الارم کے ساتھ وہ خیمہ کے باہر آتا اور چاہے
گھوڑے پر زین ہو یا نہ ہو، برہنہ تلوار ہاتھ میں لے کر اس پر سوار ہو جاتا۔ اس
معاملہ میں وہ بجلی سے کسی طرح کم نہ تھا۔

اس طرز زندگی نے ابن سعود کو ایک قوی ہیکل انسان بنا دیا اور اس کے
ارادوں میں استقامت پیدا کر دی تکلیف برداشت کرنی تو اس کے پاس
کوئی چیز نہ تھی وہ خیمہ کے دروازہ پر بیٹھکر گھنٹوں اہلِ قبائل سے ملتا
ان کے جھگڑے چکاتا۔ جاسوسوں کی لائی ہوئی خبروں پر غور کرتا،
انہیں ضروری ہدایتیں دیتا اور تمام دن اور بڑی رات گئے تک
مسلسل کام کرتا تھا۔ ان دنیوی کاموں کے باوجود اس نے ارکانِ مذہب

کبھی غفلت نہ کی۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرتا، سختی کے ساتھ روزے رکھتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔

رشید بھی ارادہ کا پکا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ بلکہ اپنے لوگوں کو جمع کر کے ابن سعود پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ مگر اس دفعہ وہ بہت کچھ تھکا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بھی بہت پست ہو چکے تھے۔ الغرض ان لوگوں نے موہنتہ گاؤں میں قیام کیا اور چین سے سو رہے کیونکہ ابن سعود ان سے زیادہ فاصلہ پر تھا اور انہیں کسی حملہ کی توقع نہ تھی۔ لیکن ابن سعود کے مخبروں نے رشید کی آمد کی اطلاع دیدی اور وہ اپنی فوج لے کر برق رفتاری کے ساتھ موہنتہ کی طرف روانہ ہوا اور صبح ہونے سے پیشتر ہی رشیدی فوج پر حملہ کر دیا۔ تھکی ماندی فوج وحشت سے اٹھی اور سپاہی تتر بتر ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ابن سعود کے آدمی انتہائی جوش میں دشمنوں پر حملہ کر رہے تھے۔ اس دہشت آفریں منظر میں بھی رشید ہراساں نہیں ہوا بلکہ نعرۂ جنگ بلند کرتا ہوا وہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ لیکن اس کی یہ جان توڑ کوشش کچھ بار آور نہیں ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ایک گولی کا نشانہ بن کر زمین پر آرہا۔ ابن سعود نے اس کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا تمام گاؤں میں پھروایا تاکہ عوام کو رشید کی موت کا عین الیقین ہو جائے۔ رشید کے قتل کی اطلاع آگ کی طرح عرب کی اطراف واکناف میں پھیل گئی اور جب شمر، اور حائل میں یہ خبر

پہنچی تو رشید کے ورثاء اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم ہو گیا اس کے ساتھ قبائل بھی کسی نہ کسی کی طرفداری کر کے ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے اور حائل کے عرض و طول میں خاصی بدنظمی پھیل گئی۔

یہ صورتِ حال ابنِ سعود کے لیے امید افزا تھی!

چھٹا باب

سعودی فتوحات اور الاخوان کی تشکیل

(۱)

ابن سعود کی عمر اس وقت ستائیس سال کی تھی۔ اس کی بہادری اور کامرانی کے ڈنکے سارے عرب میں بج رہے تھے۔ ترکوں کو نکال باہر کرنا، رشید کا خاتمہ کردینا، اپنی ذاتی کوشش و قوت سے نجد کی سرزمین پر قبضہ کرلینا، ایسے کارنامے تھے جن سے ابن سعود کی شخصیت سارے عرب میں مسلم ہوگئی۔ نہ صرف یہی بلکہ یہ کارنامے عرب کی تاریخ میں زرین حروف سے لکھے جائینگے اور رہتی دنیا تک یادگار رہینگے۔

اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود ابن سعود کو سکون قلب حاصل نہ تھا۔ وہ ہمیشہ داخلی اور خارجی معاملات میں الجھا ہوا رہتا تھا۔

عرب کے باشندے بلاشبہ اُسے بہادر اور مستقل مزاج مانتے تھے تاہم ایک نئے شخص کی حکومت تسلیم کرنے کے لیے وہ بھی تیار نہ تھے ہر قبیلہ بذاتِ خود، خود مختار اور آزادی کا طالب تھا۔ رشید کی موت سے وہ اس لیے خوش نہیں ہوئے کہ ابن سعود ان کا حاکم بنے گا بلکہ وہ اس بات پر شاداں تھے کہ اب ان کی لوٹ مار کے دھندوں کو کوئی روکنے والا نہیں رہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ابن سعود رشید کی طرح سختی نہیں کریگا۔ وہ اس سے کچھ ایسے زیادہ ڈرتے بھی نہ تھے۔ لیکن ابن سعود اس قدر منصف مزاج اور زوردار آدمی تھا کہ اس نے فوراً حکم دیدیا کہ کوئی شخص بغیر اس کی اجازت کے کسی پر حملہ کرنے یا لوٹنے کا مجاز نہیں۔ اس حکم نے قبائل کو بے چین اور باغی بنا دیا۔ یہ تو اہلِ قبائل کا حال تھا، خود ریاض کے علماء بھی ابن سعود سے بدظن ہو گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابن سعود پکّا مذہبی آدمی تھا، نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور تمام اسلامی احکامات کی سختی سے پابندی کرتا اور کرواتا تھا۔ آوارگی اور تعیش سے وہ کوسوں دُور تھا۔ اس حد تک تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی ذری بھی غلطی پکڑ لے۔ البتہ وہابی عقائد کے خلاف وہ ہمیشہ خوش وخرم رہتا تھا، فوجیوں کو کوچ کے وقت اس نے گانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عنیزہ کے باشندے تمباکو استعمال کرتے تھے، اس نے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ مبارک کا اچھا دوست تھا، غیر ممالک کے لوگوں سے خندہ جبینی سے

ملتا اور ان کی خاطر تواضع کرتا تھا۔ یہ باتیں وہابی ملاؤں کو سخت ناگوار گزرتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کو رہبانیت بنا لیا تھا۔ اسی باعث ان ملاؤں نے ابن سعود پر اعتراضات کی بوچھار کر دی اور اسے تنبیہ کیا کہ اگر یہی حال رہیگا تو یہ قبائل کو اس کے خلاف اکسا دینگے۔ ابن سعود ان کی تلخ باتوں سے بے حد غصتہ میں آیا لیکن موقع شناسی سے کام لیکر اس موقع پر انجان ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

یہ تو خانگی جھگڑے تھے۔ لیکن بیرونی حالات بھی اس کے کچھ ایسے موافق نہ تھے۔ مبارک اور ابن سعود میں بدگمانی پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ جب ابن سعود مفلس تھا مبارک نے اس کو مدد دی تھی۔ اب ابن سعود کا اثر اور اس کی حیثیت مبارک سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی لیکن اب بھی مبارک پہلے کی طرح ابن سعود کو ہدایتیں دیتا اور بلا چون وچرا انکی پابندی کروانا چاہتا تھا۔ ابن سعود کو یہ برتاؤ ناگوار گذرا اور مبارک بھی اس کی ترقی کو دیکھکر جلنے لگا۔ اس طرح دونوں کے دل ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ مبارک نے اپنے اثر کو بڑھانے کے لیے ترکوں سے مل کر ایک معاہدہ کر لیا اور ترکوں نے اپنے مقصد کی تحت اس سے دوستی کا عہد کرکے اسے امداد بھی دی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابن سعود اور مبارک میں کھلی مخالفت نہیں ہوئی بلکہ دونوں ایک دوسرے کو اب بھی اپنا دوست جتلاتے رہے۔ مگر

مبارک نے اس کے خلاف کارروائی شروع کردی۔ کویت اور نجد کے درمیان قبائل مطیر آباد تھے، یہ لوگ بڑے باغی اور بدفطرت تھے۔ وہ کسی کی حکومت نہیں چاہتے بلکہ بالکل آزاد رہنے کے خواہاں تھے۔ لیکن ابن سعود اپنی حکومت کا سکہ بٹھانے کے لیے ان پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ جس سے وہ دونوں میں ابن سعود کے مخالف ہو گئے۔ مبارک ان کے شیخ فیصل الدویش سے مل گیا، اور رشیدی خاندان کو صلاح دی کہ وہ اپنے خانگی جھگڑے ختم کر کے مطیر کے ساتھ مل جائیں۔ اس کے بعد اس نے بریدہ کے عامل کو ابن سعود کے خلاف ورغلایا۔ اور یہ سب کارروائیاں اس نے بہت ہی راز میں کیں لیکن ابن سعود نے بھی ہر طرف اپنے آدمی لگا رکھے تھے۔ وہ ان تمام واقعات سے اچھی طرح واقف اور مخالفتوں کا جواب دینے کے لیے تیار تھا۔

بریدہ کے حاکم نے ابن سعود کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ابن سعود پہلے ہی سے تیار تھا، بلا کسی پس و پیش کے میدان میں اُتر پڑا۔ درمیان میں شمری فوج تھی دونوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ اثناء جنگ میں ابن سعود کا گھوڑا پھسل کر گر گیا جس سے ابن سعود کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے باوجود شام تک وہ برابر دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ فتح کسی کو بھی نہیں ہوئی۔ اور دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کو واپس ہو گئیں۔ رات بھر ابن سعود درد کی تکلیف سے کراہتا رہا۔ لیکن اس حادثہ سے اس نے ہمت نہیں ہاری۔ البتہ اس کے

ساتھی کچھ پست سے ہو گئے۔ لیکن دوسرے دن انتہائی درد اور تکلیف کے باوجود وہ جنگ کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور دوپہر سے پیشتر ہی دشمن کو شکست دیدی۔

اس کے بعد ابن سعود مطیر پہنچ کر وہاں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ لوٹ مار شروع کی۔ گاؤں جلا دیے، شیخ الدویش کو بھگا دیا اور اہل مطیر کو اپنے کیے کی خوب سزا دی۔ پھر وہ بریدہ کے عامل کو سزا دینے کے لیے بریدہ پہنچا۔ شہر کے دروازے بند تھے اور محاصرہ کی مدافعت کا معقول انتظام تھا۔ ابن سعود نے پہلے ہی سے اپنے چند آدمی شہر کے اندر روانہ کر دیے تھے۔ جب سب لوگ صبح کی نماز کے لیے مسجد کو گئے تو ان لوگوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور ابن سعود اندر داخل ہو گیا۔ بریدہ کے عامل نے ابن سعود کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ اسے یقین تھا کہ ابن سعود بغیر قتل کیے نہیں رہیگا۔ لیکن ابن سعود نے حقارت سے اسکی طرف دیکھکر اس کے خاندان والوں کو بلا کر سب کو ایک ساتھ نجد کے باہر ہو جانے کا حکم دیدیا۔

بریدہ بڑا خطرناک شہر تھا، اس کی فصیل نہایت مستحکم تھی۔ یہاں کے لوگ مالدار اور باغی طبیعت کے تھے۔ تجارتی مرکز ہونے کے باعث اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس لحاظ سے یہ نجد کی کنجی تھی۔ یہاں حکومت کرنے کے لیے ایک اچھے آدمی کی ضرورت تھی۔ ابن سعود کی نظرِ انتخاب اپنے چچیرے بھائی جلوی پر پڑی۔

جلوی ابن سعود کا نہ صرف رشتہ دار بلکہ بہت ہی گہرا دوست بھی تھا۔ ریاض کی فتح کے وقت وہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کی بہادری، مستقل مزاجی اور فرض شناسی کا سکہ عربوں کے دل پر اچھی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ضبط کا بڑا خیال تھا، اور قانون کی پابندی میں وہ اپنے پرائے کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ بریدہ کے عامل کی حیثیت سے اس نے اپنے فرائض اس عمدگی سے انجام دیے کہ شمالی نجد کے باشندے لوٹ مار اور فساد کا نام تک بھول گئے۔

(۲)

بریدہ کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ابن سعود ریاض پہنچا۔ یہاں آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ گزشتہ سال "انجمن اتحاد و ترقی" کے باغی نوجوان جنہوں نے سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر دیا تھا اب معزول سلطان کی طرح اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے آرزومند تھے اور اس سلسلہ میں چاہتے تھے کہ عرب کے مالدار شہروں۔ حجاز، مکہ، مدینہ، عسیر، پر قبضہ جمائیں۔

اس مقصد کی تحت انہوں نے بہت جلد دمشق سے مدینہ تک ریل کی پٹڑی ڈالنے کا ارادہ کیا تاکہ سپاہیوں اور زائرین کو لانے لیجانے میں سہولت ہو۔ انہوں نے حسین بن علی کو مکہ کا شریف اور حجاز کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص کئی امتیازی خصوصیات کا مالک تھا۔ اس نے کئی ملکی خدمات انجام دیے تھے اور عرصہ تک سلطنت کا مشیر بھی رہا تھا۔ ذاتی وجاہت ہتا ت

اپھی تھی، عمر پچاس سے اوپر، ڈاڑھی چھوٹی مگر خوبصورت، بات نہایت آہستہ کرتا اور دوران گفتگو میں خاص خاص جملے اور محاورے استعمال کرتا تھا تاکہ سامعین پر رعب پڑ سکے۔ حسین کا تعلق خاندان بنی ہاشم سے تھا۔ اسی لیے ترکوں نے حجاز کی گورنری کے لیے اسے بھیجا، اور انہیں اس پر کافی اعتماد بھی تھا۔

نجد اور حجاز کے درمیان ایک وسیع میدان ہے جہاں قبیلہ عتیبہ کے لوگ اپنے اونٹ اور بکریاں چرایا کرتے تھے، یہ میدان ایک حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا تھا کیونکہ نجد سے جو قافلے حجاز و مکہ کی طرف جاتے انہیں اسی میدان سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اس طرح سے یہ گویا حجاز کی کنجی تھی۔ حسین سے اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا اور ابن سعود کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس پر حسین اور ابن سعود دونوں میں تن گئی۔ ابن سعود قبائل عتیبہ سے ٹیکس طلب کرتا تھا اور حسین اسے اپنا علاقہ جتلاتا تھا۔ ابن سعود نے مشرق کی طرف سے عتیبہ پہنچکر وہاں کے باشندوں سے اپنی اطاعت منوائی، حسین نے ابن سعود کی تنبیہ اور اس کو وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے اپنے لڑکے عبداللہ کو مغرب کی طرف سے بھیجا۔ ابن سعود نے بھی اپنے بھائی سعد کو روانہ کیا لیکن سعد گرفتار کر لیا گیا۔

ابن سعود کو اس بات پر غصہ آیا اور وہ حسین پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس اثنا میں اس پر ایک مصیبت یہ آن پڑی کہ ابن سعود کے

چچیرے بھائیوں نے عجمانیوں کو اُبھار کر اس کے خلاف آمادہ کیا اور اہلِ ریاض کو دھمکی دی۔ شہر یبلی کے باشندوں نے بھی ابن سعود کے مخالفین کا ساتھ دیا۔

ابن سعود بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ اگر وہ حسین پر حملہ کر بیٹھے اور پیچھے سے عجمانی اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ ان دونوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر اس نے حسین سے فوراً صلح کر لی اور کچھ تاوان ادا کر کے سعد کو واپس بلا لیا اور اس کے بعد تیزی سے ریاض پہنچا۔ اس وقت تک اس کے چچیرے بھائی ریاض کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ابن سعود نے ان پر بڑے زور سے حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ اور عجمانیوں کو احساء تک ہٹا دیا۔ بعض بھائیوں نے احساء کا رُخ کیا اور چند لوگوں نے مکے جا کر حسین کے پاس پناہ لی۔

نجد کے شمال میں رہنے والوں کے لیے یہ شکست ایک طرح کا سبق تھی، ابن سعود چاہتا تھا کہ جنوب کے باشندوں کو بھی اسی طرح کا ایک سبق دے کیونکہ یہ لوگ بھی اہلِ ہطیر کی طرح اس کے ماتحت تھے لیکن اب باغی بن گئے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اس طرف اپنے لوگ روانہ کیے جنھوں نے بے رحمی کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی اور قصبوں اور گاؤں کو آگ لگانے لگے۔ ابن سعود نے خود شہر یبلی کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر اہلِ شہر کو بُری طرح شکست دی۔ شہر کے دروازے کے سامنے ایک بڑا چبوترا بنوایا اور صبح کو

خود اس چبوترہ پر متمکن ہوا۔ اس کے سامنے شہریوں، دیہاتیوں اور نزدیک و دُور کے بدویوں کا ایک جم غفیر تھا، وہابی جنگجو سب انتظام کر رہے تھے اور اس کا محافظ دستہ ہمرکاب تھا۔ ابن سعود اس وقت ہر بات کا حاکم اور مقتدر تھا۔ وہ تمام احکامات خود صادر کر رہا تھا، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو اس نے شہر کے انیس سرغنوں کو بلایا، وہ آئے اور چبوترہ کے سامنے سب کے سب سرنگوں کھڑے ہو گئے۔

تب ابن سعود نے کہا

"خدا سے بڑھکر دنیا میں کوئی ہستی اُولوالعزم نہیں ہے"۔

یہ کہکر اس کے ساتھ ہی ایک اشارہ کیا اور ایک حبشی غلام برہنہ تلوار لیکر پہنچا اور یکے بعد دیگرے ان سرغنوں کو قتل کرتا گیا۔ جب اٹھارہ آدمی ختم ہو چکے تو ابن سعود نے انیسویں کو معاف کر دیا اور کہا۔

"جا اور جاکر لوگوں سے وہ سب کچھ کہدے جو تونے دیکھا ہے"۔

اس قصہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجمع کو مخاطب کر کے گرجتی ہوئی آواز میں تقریر کرنے لگا۔ اور بغاوت کے نتیجہ پر روشنی ڈالی۔ لوگ اس کی تقریر سنکر مبہوت تھے۔ مجمع پر ایک سکوت کا عالم طاری تھا، ابن سعود کی گرجتی ہوئی آواز دھیمی پڑنے لگی، اس نے عوام کو اپنے نزدیک بلایا اور محبت کے لہجہ میں آہستہ آہستہ بولنے لگا آخر میں اس نے کہا۔

"اب تم کسی موزوں آدمی کو اپنا حاکم مقرر کر لو اور یاد رکھو کہ جب تک تم اس کے اطاعت گزار رہو گے امن نصیب ہوگا۔"

تمام دن ان اٹھارہ آدمیوں کی لاشیں کھلے میدان میں جلتی ہوئی ریت پر پڑی رہیں کہ باغی لوگ اس نظارہ سے کچھ غیرت وعبرت حاصل کر سکیں، شام کے وقت ان لاشوں کو سپرد خاک کیا گیا۔

لیلیٰ کا یہ واقعہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ تک تیزی کے ساتھ پہنچ گیا۔ اہل عرب پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ وہ کبھی توقع نہیں کرتے تھے کہ اس دور میں بھی کہیں ایسا انصاف ہو سکتا ہے! ابن سعود کا یہ فعل انصاف کا ایک درخشاں کارنامہ تھا۔ عربوں کی نظر میں اس کی وقعت بڑھ گئی اور وہ سمجھنے لگے یہی ایک ایسا بہادر، منصف مزاج اور جنگجو ہے جو ہم پر حکومت کر سکتا ہے۔

(۳)

اس واقعہ سے نجد کے اس گوشہ سے لیکر اس گوشہ تک ابن سعود کی دھاک بیٹھ گئی۔ اندرونی بغاوت دُور ہو چکی، رشیدیوں کا خاتمہ ہو گیا، ترک بے دخل کیے گئے اور بنی شمر کا کوئی سردار نہ تھا۔ اس طرح اندرونی معاملات بہت بڑی حد تک سلجھ چکے تھے البتہ ابن سعود کے لیے ابھی بدویوں کو یہ سبق دینا باقی تھا کہ لوٹ مار اور دنگہ فساد ان کا پیدائشی یا توریثی حق نہیں ہے اور وہ بھی

دوسروں کی طرح قانون کی پابندیوں سے بے نیاز نہیں بلکہ ان میں سختی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں ۔

(۴)

ابن سعود بہت ہی جفاکش اور منصف مزاج تھا۔ اس کے تمام کاروبار چاہے وہ ادنیٰ ہوں کہ اعلیٰ، سب عوام کی نگاہوں کے سامنے کھلے میدان میں انجام پاتے تھے ۔ ریاض میں محل کی سیڑھیوں پر بیٹھکر وہ اپنی رعایا کی فریادیں سنتا اور فیصلے صادر کرتا تھا۔ دوران سفر میں خیمہ کے دروازہ پر بیٹھکر قصے چکاتا اور گاؤں میں بالعموم مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھکر فیصلے کرتا تھا ۔ ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ وہ بلا کھٹکے اور بلاتوسط راست اس سے آکر اپنا معاملہ بیان کرے چنانچہ چشموں کے جھگڑے، نخلستانوں کے حقوق کی نزاعات، اونٹوں کی ملکیت، ڈاکہ، چوری یا مار پیٹ کے جھگڑے وہ خود چکاتا تھا ۔ ذرہ برابر بھی کسی کے ساتھ رعایت کرنا گناہ سمجھتا تھا قرآن پاک اس کا قانون تھا اور وہ ٹھیک اسی کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا ۔ مدعی اور مدعی علیہ کے بیانات خود قلمبند کرتا۔ شہادتوں کو خود سنتا اور خود فیصلے صادر کرتا تھا اور اس کے فیصلوں کا کوئی مرافعہ نہ تھا ۔

ایک دفعہ ایک بدوی نے کسی اونٹ کے بازو سے کچھ سامان اٹھالیا۔ صاحب مال نے ابن سعود کے سامنے آکر قسم کھائی،

شہادت لی گئی ۔ شہادت مکمل تھی ۔ جلاد کو حکم ہوا کہ ہاتھ اڑا دو ۔ یہ ہاتھ سارے شہر میں پھرایا گیا کہ اوروں کو عبرت حاصل ہو ۔

ایک مرتبہ ایک عورت اور مرد آوارگی کے مرتکب ہوئے ۔ عورت بڑی تریا چلتر تھی اور مرد نے اس کے لیے کویت سے شراب منگا رکھی تھی ۔ واقعات کی تصدیق کی گئی ۔ اس کے بعد ابن سعود نے حکم دیا کہ عورت کو کوڑے مارتے ہوئے شہر سے باہر نکال دیا جائے اور مرد کو خوب کوڑے لگائے جائیں اور اگر وہ اس پر بھی زندہ رہے تو احساء بھیج دیا جائے ۔

ایک مرتبہ دو آدمیوں میں لڑائی ہو گئی، ان میں سے ایک مارا گیا ۔ قاتل گرفتار ہو کر مستوجب سزا ٹھہرا ۔ مقتول کے رشتہ داروں نے خون بہا لینے پر رضامندی ظاہر کی ۔ ابن سعود نے دیت ہی پر فیصلہ کیا ۔

ایک دفعہ ایک عورت روتی ہوئی اس کے پاس آ کر شکایت کرنے لگی کہ ہمسایہ کی گائے نے اس کے باغ میں گھس کر گھاس کھائی ہے ۔ ہمسایہ نے قسم کھا کر انکار کیا ۔ ابن سعود نے قصاب کو بلا کر گائے کا پیٹ چروایا ۔ پیٹ میں گھاس موجود تھی ۔ ہمسایہ کو نقصان بھرنا پڑا اور جھوٹی قسم کے الزام میں اُسے سخت جرمانہ بھی کیا گیا ۔

ابن سعود کے لیے حکومت کرنا آسان کام نہ تھا اس کیلیے

بڑی ہمت اور سلیقہ کی ضرورت تھی۔ اگر سمجھداروں سے سابقہ پڑتا تو اور بات تھی، یہاں وہ جاہلوں سے دو چار تھا، اس کے علاوہ اس کے پاس حکومت کی آڑ بھی نہ تھی جس سے اس کی لغزشیں چھپ جاتیں، وہ بذات خود حکومت تھا اور سب کی نظریں ہر دم اسی پر رہتی تھیں اگر اس معاملہ میں اس سے ذری بھی فروگذاشت ہو جاتی تو قبائل اس کے ہاتھ سے نکل جاتے، سوال یہاں صرف شخصیت کا تھا اور ابن سعود ایسی ہی اولوالعزم شخصیت کا مالک تھا جیسی کہ ان جہلا کے لیے ضرورت تھی اور جس کے آگے انہیں چوں وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

(۵)

بدویوں کی سرکوبی کے لیے ابن سعود جنوب کی طرف روانہ ہونے کو تھا کہ مخبروں نے اطلاع دی کہ دویش قبائل مطیر کو ورغلا کر اس کے خلاف آمادہ کر رہا ہے، حسین، شریف مکہ نے بھی ہوس کے جال پھیلا دیے ہیں اور شامیوں نے اسے عرب کا بادشاہ بننے کا لالچ دیا ہے اور اسی طرح مبارک اور اس کے چچیرے بھائیوں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔

یہ سب ترکوں کی کارستانی تھی۔ قبائل شمر اور مطیر اور مبارک کو ان کی طرف سے رقمی اور فوجی امداد دی جا رہی تھی، حسین سے بڑے بڑے وعدے کیے جا رہے تھے، بغداد میں فوجیں جمع ہو رہی تھیں، احساء کے دارالخلافہ ہفوف میں بھی جنگی انتظامات مکمل ہو چکے تھے، غرض

ابن سعود کی مخالفت کے لیے ہر طرح کا انتظام ہو چکا تھا لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس سے قبل بھی جبکہ ترکوں نے ابن سعود کا پیچھا اٹھایا' انہیں کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ فوجیں واپس بلالینی پڑیں اور اب کی دفعہ بھی یہی ہوا۔ چنانچہ ابن سعود پر حملہ کرنے کی تیاریوں کے مکمل ہوجانے کے بعد فوراً حکومت قسطنطنیہ نے بغداد، بصرہ اور ہفوف سے اپنی فوجیں واپس بلالیں کیونکہ اطالوی فوجوں نے طرابلس پر حملہ کردیا اور بلغاریوں نے جنگ کا اعلان کردیا تھا، جس کے ماتحت ترک سخت خطرہ میں تھے۔

ابن سعود کو یہ سنہری موقعہ ہاتھ آگیا۔ کیونکہ ترک ہی اس کے لیے سخت خطرناک تھے۔ مطیر، عجمان، شمر، رشیدی اور حسین وہ سب سے نبٹ سکتا تھا، یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی البتہ ترکوں کی منظم فوجوں سے مقابلہ کرنا یقیناً اس کے بس سے باہر تھا اب جبکہ ترک اپنے اندرونی معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور عرب کی طرف ان کی قوت کمزور پڑ چکی تھی' ابن سعود نے یہی مناسب خیال کیا کہ اس زرین موقعہ سے فائدہ اٹھا کر احساء سے ترکوں کو نکال دیا جائے۔ اس مقصد کی تحت وہ اپنے منصوبے گھڑنے لگا اور صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے احساء کی طرف اپنے مخبروں کو روانہ کیا۔ مخبروں نے اطلاع دی کہ ہفوف اور دیگر ساحلی شہروں میں اب ترکی فوج بہت کم ہوگئی ہے احساء اور بالخصوص ہفوف کے باشندے ترکوں سے بہت تنگ آگئے

ہیں، امن نام کو نہیں ہے، شہر میں بچے لفنگے بھرے پڑے ہیں، بدوی جب دل چاہتا ہے لوٹ مار اور غارتگری کرتے ہیں، ان سے کوئی پرسش نہیں کی جاتی، جس گاؤں کو جی چاہے وہ لوٹ لیتے ہیں اور ہفوف میں داخل ہوکر جانور چرالے جاتے ہیں۔ یہ ترکوں کی علانیہ چھبتیاں اڑاتے ہیں قافلوں سے کافی روپیہ وصول کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود قافلوں کے منزل مقصود تک صحیح وسالم پہنچنے کا اطمینان نہ تھا حتیٰ کہ شہر سے ساحل تک کا مختصر سا رستہ بھی محفوظ نہ تھا چنانچہ چند ہفتہ پہلے بدوؤں نے ترکوں کو مارپیٹ کرکے ۵۰ اونٹ اور ان کا سازو سامان لوٹ لیا تھا عقیر کے موتی نکالنے والے ڈاکو بن کر جہازوں کو لوٹ رہے ہیں، اس طرح بندرگاہ عجیر میں کسی جہاز کو داخل ہونے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ مخبروں نے یہ بھی اطلاع دی کہ اس علاقہ کے لوگ ابن سعود کی اطاعت قبول کرنے تیار ہیں تاکہ انہیں امن وامان نصیب ہوسکے۔

ابن سعود نے سوچا کہ ایسے موقعہ پر بدمعاشوں کی سرکوبی کرکے اگر علاقہ احساء اور بالخصوص شہر ہفوف کے باشندوں کی مدد کی جائے تو ان کے دلوں پر اس کا گہرا اثر ہوگا اور وہ ایک طرح سے اس کی امداد کو بہت بڑا احسان ماننے لگینگے۔ یہ خیال آتے ہی ابن سعود نے اپنی سپاہ جمع کرکے حملہ کی تیاری شروع کردی، کھانے اور پانی کا کافی انتظام کیا، اونٹ تقسیم کرکے ایک تاریک رات میں سفر کا آغاز کردیا اور ریگستان دہنہ سے ہوتے ہوئے احساء اور پھر سیدھے ہفوف پہنچا۔

قلعہ کی فصیل مضبوط اور کافی اونچی تھی، خندق بھی ابھی حال حال میں نئی کھدی تھی، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر برج بنے ہوئے تھے اور ان پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے قلعہ کے سامنے کھجور کے گھنے درخت تھے، ابن سعود نے اپنی فوجوں کو یہاں چھوڑ دیا اور خود سات سو سپاہیوں کے ساتھ، رسیاں اور کھجور کے تنوں کی بنی ہوئی سیڑھیاں لے کر قلعہ کی طرف بڑھا اور قلعہ میں داخل ہونے کے لیے ایک پست دیوار کا انتخاب کیا۔ جہاں خندق بھی سوکھی ہوئی تھی۔ سپاہی سیڑھیوں کے ذریعہ اُوپر چڑھنے لگے۔ قلعہ کے ایک سپاہی نے ان کی کچھ آہٹ سی سنی اور آواز دی، لیکن یہاں سے کچھ جواب نہ ملا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا پھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ابن سعود سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کے اندر داخل ہوگیا۔ کچھ سپاہی پہرہ والوں کی طرف لپکے اور کچھ قلعہ کے پھاٹک پر پہنچ کر وہاں کے فوجی دستی کی خبر لینے لگے۔ یہ بیچارے اس اچانک حملہ سے کچھ ایسے بدحواس ہوئے کہ الارم تک نہ دیا اور ہر ایک اپنی جان بچانے کے فکر میں پڑ گیا۔

صبح ہوتے ہوتے ابن سعود کی ساری فوج قلعہ کے اندر داخل ہوگئی۔ ترکی گورنر اور اس کے سپاہی مارے وحشت کے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اکثروں نے مسجد ابراہیم میں پناہ لی اور اندر سے دروازے بند کر لیے۔ ابن سعود نے ترکی گورنر کے پاس کہلا بھیجا کہ

"اگر اس طرح سے مدافعت کی جائیگی تو پھر اس کا مزہ چکھنا پڑیگا

بہتر ہے کہ قلعہ سے باہر چلے جاؤ، معافی دے دی جائیگی"

گورنر نے بلا چوں وچرا اس بات کو تسلیم کر لیا اور دوسرے روز اپنی فوج کے ساتھ قلعہ سے باہر نکل کر بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔

اس کے بعد ابن سعود احساء میں سے گذرا۔ قبائل نے اس کی اطاعت قبول کی، عجیر اور قطیف کی بندرگاہیں لے لی گئیں اور کویت کی سرحد تک کا ساحلی علاقہ اس کے قبضہ میں بھی آگیا۔ ابن سعود نے اس صوبہ کا گورنر جلوی کو مقرر کیا۔

ترک مصلحتاً اس واقعہ سے ناراض نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر کے اس سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے احساء، نجد کا علاقہ قرار دیا گیا اور ابن سعود نے ترکوں کی برائے نام شاہنشاہیت تسلیم کی۔ اس صلہ میں ترکوں نے ابن سعود کو بہت سی رقم اور ہتیار دیئے۔

(۶)

احساء کی فتح سے ابن سعود کی شہرت میں چار چاند لگ گئے، اس کے حوصلے بلند اور اس کی ہمت میں دہ گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ اب جزیرۂ عرب کی طرف جنوبی حدود اور بحیرۂ قلزم کی طرف عتیبہ تک قبضہ کرنا، کویت پر حکومت اور شمر اور حائل کے علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کا آرزومند تھا۔ لیکن اس جنگ وجدل، فتح ونصرت اور مسلسل کامرانی کے چڑھتے نشہ میں اس نے اپنے باپ کی نصیحت نہیں بھولی۔ وہ محسوس

ٹک کر نہیں رہے۔ آج اِدھر تو کل اُدھر۔ یہ محض جہالت کی وجہ تھی۔ تاوقتیکہ ان کو ایک رشتہ میں منسلک نہ کیا جائے کام بننا مشکل تھا۔

جہلا کی اس کثیر جماعت کی تنظیم اور انہیں رستہ پر لانے کے لیے ابن سعود نے ایک عجیب نفسیاتی ترکیب نکالی۔ اس نے سوچا اگر ان سب کو کاشتکار بنا دیا جائے تو پھر وہ ٹھیک ہو جائینگے۔ بات تو بڑی عمدہ تھی لیکن کام آسان نہ تھا۔ اس معاملہ میں اس نے مذہب سے امداد لینی مفید سمجھی، کیونکہ بدویوں کو اکسانے کے لیے مذہب ہی ایک اچھا اور مفید حربہ تھا۔ اس سلسلہ میں مذہبی پیشواؤں سے اتحاد کرنا اس کے لیے نہایت ضروری تھا۔ ریاض میں عبدالوہاب کے خاندان کے بہت سے علماء تھے۔ ابن سعود گو ان کا امام تھا لیکن اپنی حیثیت کو اور مستحکم کرنے کے لیے اس نے عبدالوہاب کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کے بطن سے بعد میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام **فیصل** رکھا گیا۔

ابن سعود نے نہایت موثر انداز میں اپنی اس تحریک کو مذہبی پیشواؤں کے آگے پیش کیا جس کو سب نے بالاتفاق نہ صرف تسلیم ہی کیا بلکہ ہر طرح اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ابن سعود نے ایک ایک کو پچاس پچاس آدمیوں کا ذمہ دار قرار دیا اور اس کام کو اپنے والد کے تفویض کیا۔ عبدالرحمٰن کی عمر گو اب بہت زیادہ ہو گئی تھی تاہم اس میں ابھی بہت کچھ جولانی باقی تھی، وہ اکثر اہل قبائل سے

علما اور انہیں مختلف امور سے متعلق مشورے دیتا تھا، اس کا زیادہ تر وقت عبادت، مراقبہ اور دینی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا ایک سچے دیندار کی طرح اس کی حیثیت مسلم تھی اور لوگوں، بالخصوص ملاؤں پر اس کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ ابن سعود نے جب یہ اصلاحی تحریک ان لوگوں کے آگے پیش کی تھی تو سبھوں نے تحریک کی نوعیت کے لحاظ سے اس کو خوش آمدید کہا لیکن دلوں میں ابن سعود کے متعلق کچھ شک ہی رکھتے تھے۔ مگر جب عبدالرحمٰن اس معاملہ میں بیچ میں آگیا تو اب کسی کو نہ تو اعتراض کی گنجائش رہی اور نہ ان کا شک باقی رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملا اس کام کو ابن سعود کا کام نہیں بلکہ اپنا ذاتی کام تصور کرنے لگے۔ اس اصلاحی، یا تنظیمی جماعت کا نام "الاخوان" رکھا گیا۔

اس کے بعد ہی ریاض کے کٹے ملاؤں نے قبائل کے ملاؤں اور پیش اماموں کے پاس احکامات بھجوا دیے کہ وہ اہل قبائل کو اس امر کی تعلیم دیں کہ

مُسلم کا خون مُسلم کو کبھی نہیں بہانا چاہیے رسُولِ خدا کا حکم ہے کہ کاشت کرو

عرب اور بالخصوص بدوی بڑے قدامت پسند واقع ہوئے تھے، ابتدا میں انہوں نے اس تنظیم سے ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی روایات میں کسی قسم کی تبدیلی کی جائے یا انہیں کسی بات کا

پابند کر کے ان کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ البتہ سب سے پہلے آل حرب نے اس اسکیم کی بڑی گرم جوشی کے ساتھ تائید کی اور اس قبیلہ کے شیخ سعد ابن مطیب نے اس کام کے لیے کچھ رضا کار فراہم کر لیے اور ارطاویہ میں قیام کیا۔

ارطاویہ ایک اجڑا ہوا بنجر مقام تھا۔ البتہ وہاں اچھے پانی کے چند چشمے تھے، کچھ جانور چرتے تھے اور مسافر ٹھہرتے اور پانی پیا کرتے تھے۔ ان چشموں کے اطراف کی زمین افتادہ تھی اور چند کھجور کے درخت اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔

ابن سعود نے اس معاملہ میں خاطر خواہ دلچسپی لی۔ مطیب اور اس کے ہمراہیوں کو روپیہ پیسے سے امداد دی، زراعت کے طریقے بتلائے، خود کام کی نگرانی کی، ایک مسجد بنوائی، پابند مصلیوں کو بطور تحفہ کے ایک ایک بندوق عطا کی۔ اس طرح سے ارطاویہ آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، ایک چھوٹے گاؤں سے ایک اچھا شہر بن گیا۔

ارطاویہ کے باشندے علاقۂ نجد کے سب باشندوں سے زیادہ مذہبی اور کٹّے وہابی تھے۔ صرف قرآن مجید ان کے پیش نظر تھا۔ ان لوگوں نے عربی عمامہ پہننا ترک کر دیا اور امتیاز کے لیے سفید شملہ باندھنے لگے۔ "الاخوان" کا نام ان کے لیے بہت ہی ہمت افزا ثابت ہوا۔ ارطاویہ کی اس ترقی کو دیکھ کر اکثر قبائل "الاخوان" کی جماعت میں شرکت کے لیے راضی ہو گئے۔ قبائل مطیر میں بھی جوش پیدا ہو گیا۔

دویش نے ابن سعود سے مل کر صلح کرلی اور ابن سعود نے اسے ارطاویہ کا عامل مقرر کردیا۔ اس طرح قبائل میں اتحاد پیدا ہوتا چلا اور وہ قبیلے جو کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اب محبوب دوست بننے لگے اور باہمی مخالفتوں کو دور کرکے ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگے۔ اس سے قبل ابن سعود جنگجوؤں کا انتخاب بہادر اور جنگجو قبائل سے علیحدہ علیحدہ کیا کرتا تھا لیکن اب اس نے ان کا انتخاب ارطاویہ کے باشندوں سے کیا جس میں مختلف قبیلوں کے لوگ شامل تھے اس طرح "الاخوان" کی تنظیم نے بیگانگی کا پردہ اٹھا یگانگت کا رنگ جمادیا۔

ساتواں باب
نشیب و فراز

(۱)

ابن سعود ادھر اپنے تعمیری کاموں میں مصروف تھا کہ اس دوران میں انگریزوں اور جرمنوں میں خوب تن گئی۔ جرمنی اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے تُلے ہوئے تھے اور انگریزی حکومت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ انگریزوں کا پلہ بھاری تھا اور وہ ان تمام مقامات پر قابض تھے جو جرمنوں کے مفید مطلب تھے چنانچہ ایک طرف مصر، نہر سوئز اور بحیرۂ قلزم اور دوسری طرف میسوپوٹیمیا اور خلیج فارس پر انگریزوں کا تسلط تھا جس سے جرمنوں کے راستے محدود ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنوں کی ترکوں سے دوستی تھی اور ترک عرب پہ حکمراں تھے تاہم انگریزوں کا زور زیادہ تھا اور ترکوں کی حکومت برائے نام تھی

انگریز اور جرمن دونوں اپنے مقاصد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ان کے قاصد سرکاری اور غیر سرکاری طور پر عرب قبائل کے حکمرانوں کے پاس پہنچ کر ان سے دوستی اور اتحاد بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، امام یمن، حسین، شریف مکہ، آل رشید، شیخ منطفک، مبارک اور ابن سعود — ان سب کو روپیہ پیسہ اور آلات حرب کا لالچ دیا گیا۔ ابن سعود کے پاس کویت سے انگریزی قونصل شیکسپیر اور بصرہ اور مدینہ سے ترکی اور جرمنی نمائندے علیحدہ علیحدہ ملنے کے لیے آئے۔ ابن سعود کے آگے اب ایک وقت طلب مسئلہ پیش ہو گیا۔ ساتھ دے تو کس کا؟ جنگ تو بدیہی تھی اور ابن سعود کا کسی کے ساتھ ہو جانا لازمی۔ مگر سوال یہی تھا کہ کس کی جانبداری مفید ہو سکے گی۔ ترک قریب ترین حکومت تھی، جرمن اس کی پشت پر تھے۔ مال اور دولت اور فوجی طاقت کی بھی ان کے پاس کمی نہ تھی مگر یہ لوگ اس کے دشمن اور رشیدیوں کے دوست تھے چنانچہ کچھ دنوں پہلے انہوں نے اس کو بے دخل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان کے ساتھ اس کی نباہ مشکل تھی۔ اب رہے انگریز۔ یہ اس کے دوست بھی تھے اور جرمنوں اور ترکوں کے مقابلہ میں کسی طرح دبتے نہ تھے۔ البتہ عرب سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اور وہ عرب سے اپنا تعلق صرف اس لیے باقی رکھنا چاہتے تھے کہ ان کے لیے ہندوستان تک راستہ کھلا رہے اور دوسرے وہ ایران میں اپنے تیل کی حفاظت آسانی سے کر سکیں۔ بہرحال ابن سعود جانتا تھا کہ انگریز ہندوستان اور مصر پر تسلط

رکھتے ہیں مسقط، حضرموت، عمان اورعدن سے ان کی دوستی ہے، بحری اور برّی قوت نمایاں ہے، فوجی تنظیم بھی کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ انہوں نے کویت سے جب ترکوں اور رشیدیوں کو نکال باہر کیا تو باوجود اس کے کہ جرمن ان کی پشت پناہ تھے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس لحاظ سے انگریزوں سے دوستی کرنی اس کے لیے مفید نظر آئی۔ تاہم پھر وہی سوال پیش ہوا کہ ترک اور جرمن اس سے قریب تھے اور انگریز دور۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ مبارک کے پاس گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مبارک اس کے خلاف سازشیں کررہا ہے تاہم اس نے اپنے دل میں کہا

"میں نے مبارک کو اپنا باپ کہا ہے، ایسے آڑے وقت میں اپنی مشکلات اسی کے آگے پیش کرونگا۔"

ابن سعود نے مبارک کو اطلاع بھیجی کہ وہ اس سے ملنے کا آرزومند ہے، مبارک نے اسے منظور کیا اور دونوں مقررہ وقت پر نجد اور کویت کے درمیان ایک گاؤں پر ملے۔ مبارک نہایت شان وشوکت اور جلوس کے ساتھ آیا، اس کے آگے اور پیچھے مسلح سواروں کا محافظ دستہ نیلی اور سنہری وردیاں پہنے ہوئے ہمرکاب تھا۔ ابن سعود اپنے محافظ دستہ کے ہمراہ نہایت سادگی کے ساتھ پہنچا اور دونوں میں بڑے تپاک سے ملاقات ہوئی، ابن سعود نے پہلے کی طرح مبارک کا احترام کیا اور مبارک بھی بڑے پن سے ملا۔ دونوں نے فی الوقت اپنے ذاتی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ کر نفس معاملہ پر گفتگو شروع کردی اور کافی بحث و

مباحثہ کے بعد مبارک نے صلاح دی کہ انگریز ہوں یا چاہے جرمن، کسی کے ساتھ بھی اتحاد اور دوستی فضول ہے۔

مبارک کی یہ ایک چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ابن سعود کا دائرہ اثر وسط عرب تک ہی محدود رہے، ابن سعود اس بات کو سمجھ گیا۔ دل میں بہت طیش کھایا لیکن اپنے جذبات کو ظاہر ہونے نہ دیا بلکہ اس نیک صلاح پر مبارک کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں خندہ پیشانی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے، ابن سعود سیدھے ریاض پہنچا۔

ابن سعود نے ابھی کوئی قطعی تصفیہ نہیں کیا۔ دونوں فریقوں کے ساتھ وہ نہایت عمدگی کے ساتھ سیاسی انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیگا، اس نے ہر دو فریق کو اپنے ماضی الضمیر سے متعلق مغالطہ میں رکھا۔ ترکوں سے نہایت کشادہ پیشانی سے گفتگو کی اور اپنے اونٹ اور گھوڑے ان سے کافی دام لے کر فروخت کر دیے۔ شکسپیر سے بھی اس کا برتاؤ مخلصانہ رہا اور اس سے کافی دولت گھسیٹی۔

(۲)

ابھی ابن سعود اپنے منصوبے گھڑ رہا تھا کہ یورپ میں "جنگ عظیم" چھڑ گئی۔ فرانس اور روس جرمنی کو کچل ڈالنا چاہتے تھے، انگلستان نے ان کا ساتھ دیا، اس کے بعد ترکوں نے جرمنوں کا ساتھ دیا اور اس طرح ترک اور انگریز ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

ابن سعود کے لیے اب یہ نہایت ہی ضروری تھا کہ وہ کسی کے ساتھ

ہو جائے یا خود اپنے آپ کو مستحکم کرلے۔ اس نے فوراً شیوخ کے نام پروانے بھیجے اور حالات کا اظہار کرکے خواہش ظاہر کی کہ ایسے نازک وقت میں عرب قبائل کا متحد ہو جانا ضروری ہے ورنہ انگریز یا ترک جب عرب پر حملہ آور ہونگے تو اُس وقت ملک کو بچانا بس سے باہر ہوگا۔ لیکن کسی نے اس کی اس آواز پر جنبش تک نہ کی بلکہ حائل میں رشید کا ایک جانشین اپنے مخالفین کو شکست دے کر ترکوں کے ساتھ مل گیا۔

حسین ترکوں کا آدمی تھا لیکن وہ اپنے لڑکے عبداللہ کے ذریعہ مصر میں انگریزوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ شامی انقلابیوں سے مل کر وہ "عرب اتحاد" کی ایک اسکیم بنا رہا تھا جس کا صدر خود ہونا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے بھی اس معاملہ میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا کیونکہ وہ ہر طرح اپنی دوستی اور اتحاد کے دائرہ کو وسیع کرکے جنگ عظیم کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے حسین نے انگریزوں سے اتحاد، روپیہ پیسہ کی امید اور "عرب اتحاد" کے گھمنڈ میں ابن سعود کو ٹکا سا جواب دیدیا۔

مبارک معمر، سنجیدہ، دوررس اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے فوراً انگریزوں سے اتحاد کرلیا۔ لیکن ابھی وہ خطرہ ہی میں تھا کیونکہ معاہدہ کے باوجود انگریزوں نے اس کے پاس فوجیں نہیں بھجوائیں اور ممکن تھا کہ کسی وقت بھی ترک بصرہ کی طرف سے اس پر حملہ کردیں۔ اسی لیے اس نے ابن سعود سے امداد طلب کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ غیر جانب دار ہی رہنا مناسب سمجھا۔

۱۹۱۵ء کے اوائل میں انگریزوں نے فاؤ نامی مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ترکوں کو وہاں سے بھگا دیا اور بصرہ میں داخل ہوکر اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کیں۔ اور ابن سعود کے پاس اپنے سفیر شیکسپیر کو روانہ کیا۔ انگریزوں کی نظر دیگر عرب حکمرانوں سے زیادہ ابن سعود پر تھی کیونکہ ایک تو اس کی حیثیت مسلم ہوچکی تھی اور دوسرے وہ وسط عرب پر قابض تھا اور جس طرف چاہتا اور جب چاہتا آسانی سے حملہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر ابن سعود ترکوں سے اتحاد کرلیتا تو پھر بغداد کی طرف انگریزوں کا رستہ مسدود ہوجاتا اور انہیں محض اس کی مدافعت کے لیے کافی سے زیادہ فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی شیکسپیر نے اس مقصد کی تحت ابن سعود کو بہت کچھ الٹا سیدھا سمجھایا اور بہت لالچ دیا لیکن وہ اپنی جگہ مستقل رہا اور اتحاد پر راضی نہ ہوا۔ یہ حال دیکھ کر شیکسپیر نے دوستانہ غیر جانبداری کے لیے کوشش کی۔ ابن سعود اس پر فوراً راضی ہوگیا۔

اس اثنار میں خبر آئی کہ رشیدی نجد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ ترکوں کی آنکھ تھی۔ ترکوں نے یہ سمجھ کر کہ کہیں ابن سعود انگریزوں سے معاہدہ نہ کرے، رشیدیوں کو رقمی اور حربی امداد دی اور انہیں ابن سعود پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

یہ خبر ملتے ہی ابن سعود نے اپنے سپاہیوں کو جمع کرنے کے لیے تیز رفتار اونٹوں پر قاصدوں کو اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ مطیر، عجمان اور دواسیر کے سوار جمع ہوگئے، نجد کے شہروں اور گاؤں سے پیادہ

سپاہی آپہنچے اور "اخوانی نوآبادیات" کے جنگجو بھی بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ آئے۔ یہ ان کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔ جب تین ہزار آدمی جمع ہو گئے ابن سعود نے شمال کی طرف کوچ کیا۔ جراب نامی مقام پر دشمنوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ ابن سعود نے فوراً حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی بالکل ریگستانی طرز پر ہوئی۔ جانبین کے سپاہی نعرہ لگاتے ہوئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

ابن سعود مطیر کے رسالہ کی سرکردگی کر رہا تھا۔ دونوں طرف سے برابر گولیاں چل رہی تھیں اور دونوں فوجیں آگے کی طرف بڑھ رہی تھیں بالآخر جب دونوں ایک دُوسرے سے قریب ہوئے تو تلواریں نیام سے باہر نکل گئیں۔ دوپہر سے شام تک خوب زور کی لڑائی ہوئی، کبھی یہ کامیاب رہے اور کبھی وہ تا آن کہ نجدی مستقل طور پر پسپا ہونے لگے، عجمانیوں نے یہ حال دیکھ کر خیموں کو لوٹنا شروع کیا۔ اس سے نجدی پست ہمت ہو گئے، ابن سعود نے انہیں سنبھالنے کی ممکنہ کوشش کی، "الاخوان" مضبوط اور ثابت قدم رہے لیکن اوروں نے دل چھوڑ دیا۔ یہ حالت دیکھ کر ابن سعود کو مجبوراً واپس لوٹنا پڑا اور جس وقت وہ ریاض پہنچا اس کے ساتھ صرف چند آدمی تھے۔

اس لڑائی میں شیکسپیر مارا گیا۔ وہ ریگستانی جنگوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ ابن سعود نے حالانکہ اسے منع بھی کیا کہ وہ اس کے ساتھ شریک نہ رہے لیکن شاید اس کی قضا پکار رہی تھی جو وہ اس کے ساتھ ہو گیا۔

ابن سعود کو شکست فاش ہو گئی۔ پھر سے ایک مرتبہ عجمانیوں نے اسے دھوکا دیا۔

یہ خبر تمام ملک میں بہت جلد پھیل گئی کہ ابن سعود نے شکست کھائی اور وہ بھی ترکوں اور رشیدیوں کے مقابلہ میں۔ اس خبر کو پھیلانے میں بدویوں کا زیادہ ہاتھ تھا۔ قافلوں کے ذریعہ احساء، حجاز، بغداد اور شام میں بھی اس کی اطلاع ہو گئی عتیبہ اور مرّہ قبائل نے خوشیاں منائیں کہ ابن سعود کی حکومت کا جوا ان کے کندھوں سے اُتر گیا اور وہ پھر سے لوٹ مار اور ظلم و تشدد کے لیے آزاد ہو گئے۔

ابن سعود کے آگے اب بہت زبردست خطرہ تھا، نہ تو اس کے پاس کافی پیسہ تھا اور نہ کافی سپاہی۔ دنیا میں چوطرف جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ترک اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور روپیہ دے دے کر قبائل کو اس کے خلاف بھڑکا رہے تھے، بدخو عجمانیوں نے اب کی دفعہ پھر اپنے کمینہ پن کا اظہار کیا۔ ابن سعود ان سب حالات کا بغور مطالعہ کر کے موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ اگر اس موقعہ پر ذرا بھی وہ پست ہمتی سے کام لیتا تو اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا۔

ابن سعود نے اس موقعہ پر ایک چال چلی۔ اس نے اپنے الاخوانی رضاکاروں کو جمع کر کے شمریوں پر حملہ کا اعلان کر دیا کیونکہ قاصدوں نے اسے اطلاع دے دی تھی کہ شمری قبائل اس وقت جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمریوں نے ابن سعود سے ایک عارضی

صلح کرلی۔

اس اثنا میں انگریز ملک پر ملک فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور بغداد تک پہنچ چکے تھے۔ ابن سعود نے اب ذرا بھی تامل نہیں کیا اور صوبۂ احساء میں بندرگاہِ عجیر پر انگریزوں سے ایک معاہدہ کرلیا اس طرح کا ایک معاہدہ اس نے مبارک سے بھی کیا کیونکہ خود مبارک اس کی امداد کا طالب تھا۔ آل عجمان کویت پر ایک ہنگامہ برپا کر رہے تھے، مبارک چاہتا تھا کہ انہیں سزا دے کر اپنا لوٹا ہوا مال ان سے واپس لے، ابن سعود اس شرط کے ساتھ اس پر راضی ہوگیا کہ مبارک اسے مالی اور فوجی امداد دے۔

اس تھوڑی سی امداد کے ساتھ ابن سعود اپنے بھائی سعد اور جلوی کو لے کر عجمانیوں کو سزا دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس دفعہ اسے بڑی دشواری پیش آئی اس لیے کہ ایک تو عجمانی اس کے جانی دشمن تھے اور دوسرے وہ قبائل جو اس کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر دل میں کڑھتے تھے، وہ بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے ابن سعود کو ہر طرف سے حملہ کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ عجمانی بہادر اور جنگجو بھی تھے اور بالطبع باغی ہونے کے باوجود ان میں خود آپس میں زبردست ایکا تھا اور جنگ کے لیے وہ بہت جلد پانچ چھ ہزار سپاہی آسانی سے فراہم کرسکتے تھے۔ یہ بھی ابن سعود کا خاتمہ کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود ابن سعود عجمانیوں کے خلاف

جنگ کرنے تیار ہوگیا۔

(۳)

ہتلان نے جب یہ سنا کہ نجدی اس کے مقابلہ کے لیے آ رہے ہیں تو فوراً جنوب میں ربع الخالی کی طرف ہٹنے لگا کہ نجدیوں کو کھانے پینے کی تکلیف ہو۔ چنانچہ ابن سعود نے جب ان کا پیچھا کیا تو اسے بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، سپاہی تھک کر چور ہوگئے اور پانی کی سخت تکلیف ہونے لگی بہرحال یہ لوگ دھوپ کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر کنزان کے سامنے عجمانیوں سے مقابلہ ہوا، ہتلان نے چالاکی یہ کی تھی کہ اپنے تھوڑے آدمی سامنے بھجوا دیے تھے اور اصل فوج پیچھے رکھ لی تھی کہ ابن سعود کو اس کے سپاہیوں کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہ ہوسکے چنانچہ جیسے ہی ابن سعود کے سپاہی آگے بڑھے ہتلان کے آدمیوں نے چوطرف سے انہیں گھیر لیا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ اب تو ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے اندر سعد گولی کا نشانہ بن گیا۔ خود ابن سعود بُری طرح زخمی ہوا اس کے فوجی پریشان و ہراسان ہوگئے۔ آخر ابن سعود کے بھاگتے ہی بن آئی۔

ابن سعود اب بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ اس کا سارا وقار جاتا رہا۔ سوائے "الاخوان" کے باقی سب قبائل اس کو ملیامیٹ کرنے کے لیے تیار تھے۔ رشیدیوں نے معاہدہ سے انحراف کر دیا اور بریدہ پر چڑھائی کرنے کے لیے بڑھنے لگے۔

اس حالت میں بھی ابن سعود نے دل نہیں چھوڑا۔ اس نے فوراً ریاض میں اپنے والد کے پاس اور کویت میں مبارک اور انگریزوں کے پاس امداد کے لیے آدمی روانہ کیے۔ اس اثناء میں قسمت نے ابن سعود کا ساتھ دیا۔ بریدہ کے باشندوں نے فہد کی سرکردگی میں رشیدیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ہتلان چاہتا تھا تو ابن سعود کا تعاقب کر کے اسے بھگا دیتا لیکن اس کی بدوی ذہنیت نے اس طرف اسے متوجہ نہیں کیا بلکہ وہ احساء کے جنوب میں گاؤں لوٹنے اور شہر ہفوف کا محاصرہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

عبدالرحمٰن کو ریاض میں جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ اپنے کنج عزلت سے نکل کر اطراف کے گاؤں میں گیا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کرنے لگا۔ جب ایک کافی فوج بن گئی تو اسے اپنے بیٹے محمدؒ کی سرکردگی میں ابن سعود کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ انگریزوں نے روپئے اور ہتیار روانہ کیے۔ مبارک نے شروع میں ذرا ششِ و پنج کی لیکن بعد میں اپنے بیٹے سلیم کی سرکردگی میں تھوڑی سی فوج روانہ کر دی۔

ابن سعود کی پسلیوں پر سخت چوٹ آئی تھی لیکن اس نے کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ بھائی کی موت نے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی ہتلان اور عجمانیوں سے بدلہ لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا بلکہ قسم کھائی۔ اور امداد کی توقع میں بیکار نہیں بیٹھا رہا بلکہ عجمانیوں کے مقابلہ کے لیے آدمی جمع کرنے لگا ایسے میں سلیم اور محمدؒ بھی آگئے جن سے

اس کی فوجی طاقت میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا۔

(۴)

عجمانی ہفوف کے محاصرہ سے تنگ آ چکے تھے۔ استقلال کے ساتھ محاصرہ کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا، وہ تو صرف لوٹ مار کے عادی تھے اور اسی میں انہیں لطف آتا تھا۔ کئی دن تک ہفوف کا محاصرہ کرنے کے بعد جب کچھ عمدہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو چند آدمی اپنے اپنے مکان چلے گئے، چند اِدھر اُدھر لوٹ مار کرنے لگے اور چند اطراف و اکناف میں پھیل گئے۔ اس وقت عجمانی فوج منتشر حالت میں تھی۔

ابن سعود نے محمدؐ اور سلیم کو لے کر عجمانی فوج کا رُخ کیا۔ عجمانیوں نے سعودی فوج کو بڑھتا ہوا دیکھ کر گولیاں برسانی شروع کیں۔ ایک گولی ابن سعود کے پیر میں لگی اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ محافظ دستہ نے فوراً اسے اٹھا کر خیمہ میں پہنچا دیا۔ اس واقعہ سے فوج میں کسی قدر بے چینی پیدا ہو گئی۔ عجمانی فوج تو پہلے ہی سے منتشر تھی، انہیں یہ اچھا موقع آیا اور وہ چپکے سے چل دیے۔

ابن سعود سخت تکلیف کے باوجود حاضر دماغی سے کام کر رہا تھا، اس نے محمدؐ اور سلیم کو ان کے تعاقب کے لیے روانہ کیا۔ ان دونوں نے تیزی کے ساتھ پیچھا کر کے عجمانیوں کو ملا لیا، لیکن بجائے اس کے کہ سلیم عجمانیوں پر حملہ کرتا۔ ابن سعود کا ساتھ چھوڑ کر عجمانیوں کے ساتھ مِل گیا۔

ابن سعود اب بڑے چکر میں آ گیا۔ ایک تو درد کی تکلیف اور دوسرے اطراف کے لوگوں کی چہ میگوئیاں۔ کوئی کہتا تھا "اب عثمانی آ گئے ہماری خیر نہیں، وطن واپس جانا ہی مناسب ہے" دوسرا کہتا "زخم کاری ہیں۔ ابن سعود کی خیر نہیں، خدا ہی اچھا کرے تو کرے" غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہے جا رہا تھا، حتیٰ کہ ابن سعود کے بہترین دوست اور ساتھی جو اس کی بڑی سے بڑی مصیبت میں مونس و غم خوار تھے، اب کسی قدر ہیئے نظر آنے لگے۔

یہ حال دیکھ ابن سعود نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ زخم کچھ ایسے زیادہ نہیں ہیں، درد نام کو نہیں اور اب بھی میں پہلے کی طرح بہادری اور جوانمردی سے لڑ سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے پاس کے گاؤں کے ایک شیخ کو بلوایا اور اس سے ایک ایسی کنواری لڑکی لانے کی فرمائش کی جو اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو، لڑکی آئی۔ ابن سعود سے اس کا عقد ہوا۔ اس کے بعد ابن سعود نے حکم دیا کہ فوج میں آج خوشیاں منائی جائیں۔ ابن سعود کا یہ فعل اس قدر نفسیاتی تھا کہ جس سے اس نے ٹوٹی ہوئی ہمت میں ایک جان ڈال دی، عرب اس جوش اور اس کام کو تحسین و فخر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اب ان میں ایک نئی روح آ گئی۔

ابن سعود کے ساتھی اب اس درجہ جوش میں تھے کہ چاہتا تو وہ عثمانیوں کی ہڈی ہڈی کو توڑ سکتا۔ محمد بھی اس کے لیے تلا ہوا تھا۔

سلیم کی غداری نے اسے اور بھی آگ بگولہ بنا رکھا تھا۔ لیکن ابن سعود بڑا آکلتہ رس اور سنجیدہ مزاج انسان تھا۔ سلیم پر حملہ کرنا مبارک سے علانیہ دشمنی مول لینی تھی، اس لیے اس نے محمد کو حملہ سے روکا اور مبارک کے نام ایک خط بھیجا۔

"یا والدی۔ میں نے صرف آپ کے احترام کی خاطر سلیم کو چھوڑ دیا ورنہ اس کے کیے کی سزا دیتا"

مبارک نے ابن سعود کو روکھا سا جواب دیا اور الٹے اسی پر جھوٹا الزام دھرا۔ اسی کے ساتھ مبارک نے ایک خط سلیم کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"بیٹے میں نے تمہیں لڑنے کے لیے نہیں بلکہ واقعات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیجا تھا .... اگر ابن سعود عجمانیوں کو شکست دے تو تم عجمانیوں کی امداد کرو اور اگر عجمانی ابن سعود کو شکست دیں تو تم ان کا مقابلہ کرو اور نہ کسی کو مدد دو"

جاسوسوں نے یہ خط راستہ سے اڑا کر ابن سعود کے پاس پہنچا دیا۔ ابن سعود کو اس پر بہت غصہ آیا۔ یہ مبارک کی غداری کا کھلا ثبوت تھا۔ اس نے اپنے سب لوگوں کو جمع کر کے مبارک کی غداری کا حال سنایا۔ سبھوں نے رائے دی کہ فوراً حملہ کر دینا چاہیے اور اگر اسی سلسلہ میں کویت سے بھی جنگ کرنی پڑے تو حرج نہیں، ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔

"بے شک ایسا ہی ہونا چاہیے" ابن سعود نے کہا اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

جیسے وہ چلا، اطلاع آئی کہ سلیم عجمانیوں کو چھوڑ کر فوراً کویت چلا گیا ہے کیونکہ مبارک کا یکایک انتقال ہو چکا تھا۔

"خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم خدا کے لیے ہیں" یہ کہہ کر ابن سعود سیدھا عجمانیوں کی طرف روانہ ہوا۔

یہ جنگ بڑی معرکۃ الآرا تھی۔ ابن سعود اپنے بھائی سعد کا بدلہ لینے کے لیے تُلا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہتلان کے خاندان کے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑے اور اس طرح قبائل کو ان کی غداری کا مزہ چکھا کر ایک ایسی مثال قائم کرے کہ آئندہ پھر کوئی قبیلہ ایسی حرکت نازیبا کا مرتکب نہ ہو۔ عجمانی بھی اسی طرح ابن سعود کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کی موروثی آزادی میں رخنہ انداز ہو کر انہیں اپنا محکوم بنائے۔ وہ بھی مقابلہ کے لیے ہر طرح سے تیار تھے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں تمام سال یہ معرکہ رہا۔ کبھی یہ جیتے اور کبھی وہ۔ بالآخر ابن سعود نے عجمانیوں کو مسلسل شکستیں دے کر پسپا کر دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن سعود کے ساتھی زیادہ تر "الاخوان" جماعت کے لوگ اور گاؤں والے تھے۔ یہ ثابت قدم اور مستقل مزاج تھے اور عجمانی لٹیرے۔ انہیں لوٹ مار کر کے گھر میں آرام کی نیند سونے میں مزہ آتا تھا،

انہیں بھلا مستقل جنگ سے کیا واسطہ ؟ نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں تو انہوں نے اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے بہت کچھ مقابلہ کیا لیکن جب سعودی ہمت اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے تو وہ منتشر ہو گئے۔

بہرحال یہ جنگ بہت زور دار رہی ۔ مردوں اور عورتوں دونوں نے اس میں کافی سے زیادہ حصہ لیا۔ مردوں کا کام لڑنا اور عورتوں کا کام زخمی آدمیوں کو ہلاک کرنا تھا۔ ایک مرتبہ ایک زخمی وہابی نے ایک عجمانی عورت سے پانی مانگا۔ اس عورت نے اسے اتنا مارا کہ بے چارا مر گیا۔ ایک دفعہ ایک زخمی عجمانی کنوئیں کے پاس دم توڑتا تھا امداد کے لیے اس نے ایک وہابی عورت کو پکارا ۔عورت آئی۔ اور بندوق اور لوٹے لے، اسے کنوے میں ڈھکیل کر فخریہ انداز میں گھر کی طرف چلی گئی ۔

عجمانی جب بھاگنے لگے تو ابن سعود کے لوگوں نے نہایت بے رحمی سے ان کے گاؤں جلا کر انہیں ہلاک کر دیا۔ ہتلان اور اس کے چند رفقاء احساء سے ہوتے ہوئے کویت میں داخل ہوئے۔ ابن سعود نے ان کا مطالبہ کیا تاکہ ان کا خاتمہ کر دے ۔لیکن یہاں مبارک کا بیٹا جابر حکمران تھا اور اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے ساری حکومت کی باگ سلیم کے ہاتھ میں تھی سلیم نے صاف انکار کر دیا۔ چاہتا تو وہ کویت پر بھی حملہ کر سکتا تھا لیکن ایسے حملہ سے اس نے جو انگریزوں نے معاہدہ کیا تھا وہ ٹوٹ جاتا تھا اس لیے وہ فی الوقت خاموش

رہ گیا لیکن قسم کھالی کہ جب کبھی بھی موقع ملے وہ سلیم کو اپنے کئے کا مزہ چکھائے گا۔

اس کے بعد ابن سعود نجد واپس آیا۔ اکثر قبیلے جو اس کی موقتی شکست سے بدظن ہوکر اس کے خلاف سر اٹھانے لگے تھے اب چپک کر رہ گئے۔ عجمانیوں کے ساتھ اس کا سلوک حد درجہ سخت رہا البتہ جن قبیلوں نے اس کی حکومت کو بلا چوں وچرا تسلیم کیا اور جو وقتاً فوقتاً اس کے پاس اپنے فوجی دستے روانہ کرتے رہے، ان کے ساتھ ابن سعود نے اچھا برتاؤ کیا اور بہت کچھ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

ابن سعود پھر سے ایک مرتبہ نجد میں کامران تھا!

آٹھواں باب

انگریزوں سے دوستی اور سلطنت کی تنظیم

(۱)

ابن سعود برابر دو سال تک خانگی اور بیرونی معاملات میں الجھا ہوا رہا، بالآخر ۱۹۱۶ء میں اس کے قدم جم گئے اور اس کی حکومت ایک حد تک مسلم ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک عربستان کے سرحدی مقامات پر سخت جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے شروع میں شکست کھائی لیکن جب ان کی مزید فوج کمک کے لیے آ گئی تو انہوں نے آسانی کے ساتھ بغداد پر قبضہ کر کے موصل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس دوران میں جنرل الن بی Allenby بیت المقدس کو فتح کر کے دمشق کی مدافعت کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

یہ حال دیکھ کر حسین، شریف مکہ انگریزوں کی دوستی کا اعلان کر کے

ترکوں سے برسرِ پیکار ہو گیا۔ ابتداء میں انگریز ابن سعود کی طرف جھکے ہوئے تھے اور اس کے اتحاد کو اپنے لیے ضروری خیال کرتے تھے لیکن جب جرآب پر اسے شکست ہوئی تو ابن سعود کا وقار ان کی نظروں میں کم ہو گیا اور وہ اسے چھوڑ حسین کی طرف رجوع ہوئے۔ اس کے علاوہ حسین کی دوستی انگریزوں کے لیے ایک اور وجہ سے بھی مفید ہو سکتی تھی۔ وہ یہ کہ حسین مقاماتِ مقدسہ کا والی تھا اور اس طرح سے مسلمان لازماً اسی کی طرف داری کرتے۔ مزید برآں اگر انگریز، حسین سے دوستی نہ کرتے تو جرمن حجاز پر حاوی ہو جاتے، اس طرح سے انگریزوں کا راستہ رُک جاتا۔ اس لیے انہوں نے حسین کی دوستی کو غنیمت خیال کیا اور اس کے معاوضہ میں ماہانہ بیس ہزار پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی اس کے اسے "عرب اتحاد" کا صدر بنانے کا بھی لالچ دیا۔

ترکوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے انقلابی انجمن کے چند سربرآوردہ لیڈروں کو شام میں سولی دے دی۔ حسین نے ترکوں کی اس کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ترک اس پر بہت بگڑے اور ترکی گورنر جمال پاشا نے حسین کو سخت دھمکی دی اور ساتھ ہی اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے مدینہ میں اَور فوج روانہ کی۔

اس کے بعد حسین نے اَور سر اٹھایا اور بغاوت کر کے اپنے آپ کو عرب کو آزادی دلانے والا لیڈر جتلانا شروع کیا۔ حسین کے بیٹے علی، عبداللہ اور فیصل نے مدینہ پر دھاوا کر کے ترکوں کو نکال باہر کر دیا۔

ترکوں نے پھر سے ایک زوردار حملہ کیا اور حجازیوں کو ساحل تک بھگا دیا۔ حسین نے انگریزوں سے امداد طلب کی۔ شروع میں تو انگریزوں نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی لیکن جب حسین کی حالت سقیم ہو گئی تو انہوں نے آخر وقت میں بندرگاہ جدّہ اور ینبوع پر اپنے چند جنگی جہاز روانہ کیے، روپیہ پیسہ، ہتیار اور بندوقوں سے بھی مدد کی اور مزید امداد کے لیے کرنل ٹی۔ ای لارنس کو روانہ کیا۔ اس امداد نے حجازیوں کی ہمت کو خاصا بڑھا دیا۔ لارنس کی قیادت ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ سونا دے دے کر حسین نے عرب کے بہترین جنگجو فراہم کر لیے حتیٰ کہ نجد کے بعض بہترین سپاہی بھی سونے کے لالچ میں اس کے پاس آ گئے۔

ہر طریقہ سے مطمئن ہو کر حسین نے ساحل کا رُخ کیا اور ریلوے لائن تک پہنچ گیا۔ دمشق اور مدینہ کے درمیان جو ریلوے کی پڑی تھی اس کو توڑ ڈالا۔ اس طرح سے ترک مدینہ میں بے یار و مددگار رہ گئے۔ لارنس اور فیصل کے زیر قیادت، حسین کے ساتھیوں نے عقبہ پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا مرکز قرار دے کر آگے کا رخ کیا۔ رستہ میں النبی کی فوج مل گئی جو دمشق پر دھاوا بولنے کے لیے شمال کی طرف کوچ کر رہی تھی ترک ہر طرف سے مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ انگریز بُری طرح ان کا پیچھا کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ترکوں کو مختلف مقامات سے بے دخل کر دیا بلکہ وہ ایک بڑی طاقت فراہم کر کے ملک عرب سے ترکوں کا نام و نشان ہی مٹا دینا چاہتے تھے۔

آئے دن انگریزوں کی فتوحات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا لیکن اس کے باوجود حالات کچھ اس قدر پیچیدہ اور نازک تھے کہ قطعی طور پر فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس کو فتح ہو گی۔ فریقین کسی طرح مطمئن نہ تھے۔ اور ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ حکومتوں کو اپنا حلیف بنائیں۔ عرب کی حد تک انگریز اپنی کامل حفاظت اور امداد کے لیے ابن سعود کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ گو انہوں نے اس کی ایک شکست کی بناء پر کچھ عرصہ کے لیے اس کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی تاہم اب اس کا ساتھ ضروری تھا کیونکہ ابن سعود عرب کے پورے وسطی حصہ پر حاکم تھا اور اس حصۂ ملک میں اس کا اچھا اثر تھا۔ اسی لیے انہوں نے ابن سعود کو حلیف بنانے کی خاطر سینٹ جان فلبی کو بھیجا جو بغداد کے سیول کمشنر اسٹاف کا ایک رکن اور سیاسی افسر تھا۔ لارڈ بل ہے ون بھی اسی کے ہمراہ روانہ کیا گیا۔

ابن سعود نے اس وفد کا نہایت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، علماء اور رعایا کی مرضی کے خلاف انہیں ریاض کے شاہی محل میں ٹھہرایا اور خوب خاطر تواضع کی۔ بل ہے ون اور فلبی نے مختلف پہلوؤں پر اس سے گفتگو کی۔ ابن سعود اسے خاموشی سے سنتا رہا اور اپنی رائے کو محفوظ رکھا۔ کیونکہ ایسے موقع پر جانبداری سے زیادہ غیر جانبداری کے سلوک کو وہ زیادہ بہتر خیال کرتا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ دوسروں کا آلۂ کار بنے۔ انگریز بھی فی الحال یہی چاہتے تھے، انہوں نے اس غیر جانبداری کے معاوضہ میں اسے ماہانہ پانچ ہزار پونڈ دینے کا وعدہ کیا۔

ابن سعود انگریزوں کو کبھی بھی امداد دینا نہیں چاہتا تھا، اس لیے نہیں کہ اسے انگریزوں سے دشمنی تھی بلکہ وہ حسین کا سخت مخالف تھا۔ اور انگریزوں کو مدد دینا بادی النظر میں حسین کو مدد دینے کے مترادف تھا۔

حسین "عرب اتحاد" کا صدر بننا چاہتا تھا۔ یہ اس کا ایک خواب تھا اگر بالفرض پورا بھی ہو جاتا تو ابن سعود اسے کب تسلیم کرنے والا تھا؟

حسین نے انگریزوں کی امداد سے نجد اور اطراف و اکناف کے دیگر قبائل سے اچھے جنگجو سپاہی فراہم کر لیے۔ ابن سعود اس پر آگ بگولا ہو گیا اور انگریزی وفد سے کہا:

"آپ لوگ جو حسین کو مدد دے رہے ہیں، سخت غلطی ہے، جیسے ہی آپ روپیہ دینا بند کر دینگے، دیکھ لینا کہ میں اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرونگا اور کس طرح تمام قبائل کو اپنے پاس بلا لونگا۔"

بل ہے ون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ابن سعود کو مجبور کیا کہ وہ حائل جا کر رشیدیوں پر حملہ کرے۔ ابن سعود نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا

"یاد رکھئے، انگریزوں سے میری دوستی نے رشیدیوں کو غیر جانبدار بنا دیا ہے۔ تاہم میں ان پر حملہ کرونگا بشرطیکہ مجھے بھی اسی طرح کی امداد دی جائے جس طرح حسین کو دی گئی ہے، اور ساتھ ہی اس کے اس امر کی ضمانت بھی دی جائے کہ جس وقت میں آگے بڑھتا رہوں، آپ کے حلیف سلیم اور حسین مجھ پر حملہ آور نہ ہوں۔"

(۲)

گزشتہ بیس سال، ابن سعود کی زندگی لڑنے بھڑنے میں گذری ۔ اسے نام کو آرام نہ ملا۔ اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ وہ اپنے محل کی حالت کو ٹھیک کر سکتا ۔ خانگی اور بیرونی معاملات نے بُری طرح اسے گھیر رکھا تھا، آج وہ کسی طرف سے مطمئن ہوا تو کل اُسی معرضِ بحث میں آگیا۔ بھائیوں کی مسلسل بغاوتوں نے اسے سبق دیا کہ خود اس کے اپنے لوگوں میں اتحاد نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ابن سعود کی کوئی باقاعدہ حکومت بھی نہیں تھی جو آسانی سے کام چلتا رہتا ۔ سارا کام ابن سعود کے سر تھا اور ہر بات کا وہی ذمہ دار ۔ اس کی ذرا سی لغزش یا پست ہمتی برسوں کی محنت کو خاک میں ملا دینے کے لیے کافی تھی ایسی صورت میں اسے کس طرح چین نصیب ہو سکتا ؟

اب واقعات بدل چکے تھے اور ابن سعود کو کچھ آرام ملا تھا اس لیے اس نے اس وقت کو غنیمت جانا اور سلطنت کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے کی طرف رجوع ہوا ۔ ہر قبیلہ اور ہر شہر کے لیے شیخ اور عامل مقرر کر دیے تاکہ یہ لوگ ضبط قائم رکھیں، ٹیکس وصول کریں اور ضرورت پر فوج فراہم کر سکیں ۔ اس انتخاب میں اس نے موروثی حقوق کا زیادہ خیال رکھا تاکہ عوام میں بد دلی نہ پیدا ہونے پائے ۔ اس طرح کا انتظام ہو لینے کے بعد خود شہروں کا اچانک دورہ کرنے لگا ۔ دورہ میں وہ عاملوں اور قبائل کے سر برآوردہ لوگوں سے ملتا، ان کے ساتھ چائے پیتا

اور مساویانہ طریقہ پر برتاؤ کرتا تھا، اس طرح سے شہر کے عام حالات سے اسے کافی واقفیت ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی ذری بھی بے ایمانی یا غداری کرتا تو اسے کافی سزا دی جاتی تھی۔ ایک دفعہ انگریزی وفد کے رکن فلبی نے شکایت کی کہ زلفی کا عامل عثمان ترکوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ ابن سعود نے تحقیقات کی اور ثبوت فراہم ہو گیا تو عثمان کے پاس فوراً ایک خط روانہ کیا:

"اے خدا کے دشمن! کیا میں نے تجھے قسم دے کر منع نہیں کیا تھا کہ ترکوں سے معاملہ نہ کر...... اس پر بھی تو اور تیرے بیٹے نے ترکوں سے مال و اسباب اور کھانے پینے کی اشیاء خریدیں اور اب وہ اور تو فائدہ کمانے بیٹھے ہیں۔ تیری یہ نازیبا سازش مدت العمر میرے حافظہ پر نقش رہیگی۔ میں اب تجھے برطرف کرتا ہوں، میری مملکت کو چھوڑ کر جہاں تیرا جی چاہے چلا جا۔ اگر تو نے اس حکم کی تعمیل میں ذری بھی تاخیر کی، خواہ وہ ایک گھنٹہ ہی کی کیوں نہ ہو، تو قسم ہے رب العزت کی کہ میں حاکم نہیں اگر اس سرزمین پر تیرا ذرّہ بھی رکھ چھوڑا۔"

عثمان، ابن سعود کی سخت طبیعت سے خوب واقف تھا۔ خط پڑھتے ہی وہ اپنا بوریا بدھنا باندھ کر نجد سے باہر نکل گیا۔

ابن سعود نے اس طرح کا انتظام کیا تھا کہ عامل اور شیوخ دونوں

مل کر عمدگی اور اطمینان سے کام کرسکیں - ہر ایک کے فرائض کی تقسیم اور تشریح کردی گئی کہ مبادا وہ خود آپس میں الجھ نہ پڑیں ۔اس کے علاوہ ابن سعود نے ہر ایک قبیلہ کو اپنے ہمسایہ قبیلہ کی حرکات وسکنات کا نگران گردانا ۔ ہر قبیلہ کا فرض تھا کہ اگر کوئی بازو والا قبیلہ اس کے خلاف سر اٹھائے یا سازش کرنے لگے تو فوراً اس کی اطلاع ابن سعود کو دی جائے۔ اس طرح سے قبائل کی تلون مزاجیوں سے ابن سعود کو کچھ دیر کے لیے نجات ملی ۔ سازشوں اور شرارتوں میں کمی واقع ہو گئی ۔اور اس طرح سے ابن سعود کی سلطنت اب کسی قدر مستحکم ہو گئی ۔

نواں باب

درمیانی زمانہ

(۱)

ابن سعود کی عمر اب سینتیس ۳۷ سال کی ہوگئی تھی (۱۹۱۷ء)۔ وہ ایک بھاری بھرکم، مضبوط جسم کا توانا انسان تھا، اس کی آنکھیں چھوٹی اور ان میں بلا کی جوت تھی۔ جب کبھی خوش رہتا، اس کی آنکھوں سے مسکراہٹ نمایاں ہوتی اور جب غضبناک ہوتا تو ان سے شعلے نکلتے۔ اس کی داڑھی چوڑی اور گھنی تھی۔ مونچھیں شرع کے مطابق کٹی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتے رہتی تھی۔ اس میں بلا کی متانت اور بردباری تھی، صورت سے ایک خاص دبدبہ ٹپکتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی یہ کوئی سنجیدہ اور اُولوالعزم حکمراں ہے۔

ابن سعود کی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ خواہ محل میں ہو یا

سفر میں، وہ ہمیشہ کفایت شعاری سے کام لیتا تھا۔ آرام کی اسے نام کو خواہش نہ تھی، محل میں بھی وہ معمولی چارپائی پر سوتا تھا، زرق برق لباس سے سخت تنفر تھا، البتہ اس کے شایہ اور عمامہ پر تھوڑا بہت زریں کام ہوتا تھا لیکن وہ بھی شرعی حدود کے اندر۔

ابن سعود بڑا ہی نفاست پسند واقع ہوا تھا، اس کی قوت شامہ بہت تیز تھی ہلکی سی خراب بُو کو بھی وہ برداشت نہ کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک "پاشا" اس سے ملنے کے لیے آیا، بہت ہی اہم معاملہ پر اس سے گفتگو ہو رہی تھی۔ گرما کا زمانہ تھا اس لیے پاشا لہسن اور پیاز استعمال کر رہا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جا رہا تھا۔ ان کی بُو سے ابن سعود کا دم گھٹنے لگا، غلام کو آواز دی اور اگر سوز منگوا کر سارے کمرہ کو دھواں دلوایا اور جب پاشا رخصت ہو کر چلا گیا تو کہنے لگا "پاشا، یہ پاشا ہے یا خاکروب"

ابن سعود غذا کے معاملہ میں بھی بہت محتاط تھا اور ہمیشہ سادہ غذائیں استعمال کرتا تھا، صبح تھوڑے سے دودھ، مسکہ اور توس کا ناشتہ بناتا اور شام میں روٹی، گوشت اور تھوڑے سے کھجور کھا لیا کرتا تھا۔ البتہ دن میں کئی دفعہ چاء اور قہوہ پیتا تھا۔

ابن سعود ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا، بیکار بیٹھنا اس کی فطرت کے خلاف تھا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کیا کرتا تھا، سوتا بھی بہت کم تھا، رات اور دن میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا ہو گا۔ وہ کہتا تھا کہ

سونے سے شعور کا بہت سا وقت بے شعوری میں ضائع جاتا ہے۔

ابن سعود کا حافظہ بھی بڑا زبردست تھا۔ ایک وقت میں وہ دو منشیوں کو مختلف موضوعوں پر لکھواتا اور اس درمیان میں کئی چھوٹے موٹے فیصلے بھی کرتا تھا۔ اگر بیچ میں کوئی دخل دیتا تو بھی اس کا سلسلۂ رجحان ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔

اس اثنا میں ابن سعود نے اپنے محل کی بھی تعمیر کرائی، اس کو وسیع کیا، اس کے اطراف مستحکم حصار تعمیر کرایا اور برج بنوائے۔ ایوان عام میں ترمیم کی اور تین ہزار آدمیوں کی نشستوں کا انتظام کیا۔

ابن سعود کا محافظ دستہ بہت زبردست تھا، اس میں نجد کے منتخب جنگجو اور تنومند حبشی غلام تھے۔ ان کا لباس سفید تھا، ہاتھ میں طلفنچہ اور چاندی کے دستہ کی تلوار ہوتی تھی۔ محافظ دستہ کے یہ سپاہی ہر وقت احکامات کی تعمیل کے لیے تیار رہتے تھے، محل میں انہی کا راج تھا۔

ابن سعود کی زندگی سادگی کا بہترین نمونہ تھی اور وہ حتی الوسع اپنے آپ کو تکلفات اور بیجا اصراف سے دور رکھتا تھا تاہم ضرورت مندوں کو خیرات دینا اور مہمانوں کو حتی المقدور عمدہ سے عمدہ تحائف دینا اس کا دستور تھا۔ محتاط تھا مگر فیاض۔ ایک مرتبہ اس کے ایک ماتحت نے اس کی فیاضیوں پر اعتراض کیا تو ابن سعود نے جواب دیا۔

"رقم جمع کرنے کے لیے خزانہ بنانا، نہ میرا دستور رہا ہے اور نہ میرے اجداد کا۔ جمع شدہ رقم فضول ہوتی ہے، دوسرے بادشاہوں کی کروڑوں کی دولت کس کام آئی؟"

ایک دوسرے معترض کو بھی اس نے اسی طرح کا دنداں شکن جواب دیا۔

"جہاں ہم بوئینگے وہیں سے کاٹ بھی سکینگے، امن اور خوش حالی کے زمانہ میں اگر میں فراغ دلی سے بیج بوؤنگا تو جنگ اور مصیبت کے زمانہ میں اچھی فصل بھی کاٹ سکونگا۔ امن کے زمانہ میں تو میں ہاتھ نہیں روکونگا اور اگر کسی کو میری عبا کی بھی ضرورت ہو تو اس کے دینے میں بھی مجھے کوئی تامل نہیں۔ جنگ کے زمانہ میں جب میں طلب کرونگا تو میری رعایا اپنی جان و مال سے مدد کرنے میں ذرا بھی دریغ نہ کریگی۔"

ابن سعود کو اسی طرح اپنے خاندان پر بھی بہت ناز تھا، افراد خاندان کے ساتھ وہ نہایت اچھا سلوک کرتا تھا اور اس امر کا کافی خیال رکھتا تھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ سعد کے انتقال کے بعد اس نے اس کی بیوہ سے عقد کر لیا اور اس کے بچوں کی پرورش بالکلیہ اپنے ذمہ کر لی۔ بیویوں کے ساتھ اس کا سلوک حد درجہ مساویانہ تھا، سب ہر طرح سے خوش تھے۔ ابن سعود اپنے والد کا حد درجہ احترام کرتا اور ضروری اور نازک مسائل میں اس کے نیک مشورے

لے کر ان پر عمل کرتا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمام بڑے آدمیوں کی طرح وہ بھی کسی قدر خیالی تھا، جب خوش ہوتا تو دل بھر کر ہنستا بولتا اور ساتھیوں کی غلطیوں کو نظر انداز کر جاتا لیکن اگر ذرا آزردہ ہوتا تو پھر تنکا بھی اس کی آنکھوں میں شہتیر بن کر کھٹکتا اور وہ غصہ کے مارے کانپنے لگتا لیکن ساتھ ہی اس کے اس کا غصہ دیر پا نہ تھا بلکہ بہت جلد اُتر جاتا تھا۔ اگر بعد میں معلوم ہو جائے کہ غلطی خود اس کی تھی تو وہ فوراً اس کا اعتراف کرتا اور اگر اس سلسلہ میں اس کی طرف سے کسی کو نقصان پہنچتا تو اس کی تلافی کر دیتا۔

ایک مرتبہ اس کے ایک خاص غلام نے کچھ غلطی کی، اس نے حکم دے دیا کہ وہ عین دوپہر کے وقت برہنہ پیر ریاض سے ہفوف چلا جائے۔ غلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ دراصل غلام بے قصور تھا تو فوراً اس نے ہفوف کی طرف تیز رفتار سانڈنی سوار روانہ کیے تاکہ وہ جلد اسے واپس بلا لائیں۔ جب غلام واپس آیا تو اسے اپنے بازو بٹھلا کر باتیں کیں اور پھر اسے گھر جانے کا حکم دیا۔ جب یہ غلام گھر پہنچا تو ایک حسین اور جمیل لونڈی اس کی منتظر تھی۔ یہ ابن سعود کا انعام تھا۔

جلوی کا بیٹا، فہاد بڑا لڑاکو اور سر پھرا تھا۔ ایک دفعہ اس نے شاہی محافظ دستہ کے ایک سپاہی کو مار دیا۔ ابن سعود نے فوراً اسے طلب کیا اور اپنے چابک سے خوب پیٹ کر خیمہ کے باہر دھکیل دیا۔

ابن سعود کے علماء میں سے ایک نے الاخوان کی جماعت والوں کے ساتھ بدسلوکی کی۔ ابن سعود نے اس عالم سے جواب طلب کیا۔ اس نے کچھ بے ادبی کی، اس پر ابن سعود نے اسے اپنے ملازمین کے ذریعے کمرے کے باہر نکلوا دیا اور حکم دیا کہ عام آدمیوں کی طرح اسے بھی ایک ہفتہ کی قید تنہائی دی جائے۔

بہرحال ابن سعود آگ کو بولا کا تھا لیکن اسے غصہ جتنا جلد آتا تھا اتنا ہی جلد اتر بھی جاتا تھا۔ اس کی اصل وجہ غذا کی بے اعتدالی تھی۔ ابن سعود بہت کم سخت بیمار پڑا، البتہ گھٹیائی بخار اور فساد جگر کا لگاؤ ہمیشہ ہی رہا۔ مگر وہ اس کی ذری بھی پرواہ نہ کرتا تھا اور جو ملے اور جتنا ملے کھا لیتا تھا۔ رمضان میں افطار کے بعد جی بھر کر میوے کھاتا اور دل کھول کر پانی پیتا تھا۔ کھانا بہت تیزی سے کھاتا اور کھاتے ہی کام کرنے بیٹھ جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اعصاب قابو میں نہ رہ سکے اور جذبات پر اس کا مضر اثر پڑا۔

ہر بڑے آدمی کی طرح ابن سعود بھی بحث و مباحثہ سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور انہی مباحثوں سے وہ اہم اور سود مند نتائج بھی اخذ کرتا تھا۔ بحث و مباحثہ اس کے اوقات فرصت کا مشغلہ تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنا اجلاس کرتا اس کے بعد کچھ دیر کے لیے حرم میں جا کر پھر اپنے دوست احباب اور مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے مختلف عنوانات۔ گھوڑے، اونٹ، شکار، جنگ، مذہبی مسائل وغیرہ پر

گفتگو کرتا تھا۔ اگر کوئی باہر والا ریاض آتا تو پھر اس کی دلچسپی کا سامان اور بڑھ جاتا اور وہ اسے دعوت دے کر بیرونی دنیا کے واقعات دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

ابن سعود رات کا راجہ تھا، تمام دن کام کرنے کے بعد بھی وہ راتوں کو بہت دیر تک جاگتا تھا۔ اس کے ساتھی نیند کے مارے غوطے لگاتے، جمائیاں لیتے اور یہ چائے اور قہوہ پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتا جب کوئی شخص بالکل غافل ہو جاتا تو اسے اس طرح جگاتا۔

"ہاں یا فعی! تو پھر اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" یہ شخص چونک جاتا اور سنبھل کر بیٹھتا۔ اس پر ابن سعود مسکرا دیتا۔ یہی اس کا مذاق تھا!

(۲)

۱۹۱۸ء میں ابن سعود کی حکومت نجد پر مستحکم ہو گئی، اور بیرونی ممالک خصوصاً جرمنوں اور انگریزوں کے پاس اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ لیکن ہمسایہ قبائل سے اس کے تعلقات کسی قدر پیچیدہ ہو گئے۔ رشیدی فی الوقت خاموش بیٹھے اطمینان کے ساتھ ترکوں سے تجارت کر رہے تھے۔ رشیدیوں نے سلیم سے ساز باز کر لی اور خفیہ طور پر کویت سے سامان منگا کر دمشق میں رہنے والے ترکوں کے پاس بھیجتے رہے۔ اس طرح ان دونوں تینوں میں ایک طرح کا ایکا ہو گیا تھا۔ ابن سعود کو سلیم سے سخت دشمنی تھی، بھائیوں کا ساتھ دے کر عین وقت پر جو اس نے دغا کی اس کا داغ ابھی اس کے دل سے مٹا نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ سلیم کو کویت سے نکال کر

وہاں بھی اپنی حکومت قائم کرلے۔ ابن سعود نے اس کی تجارت میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی، اس پر سلیم نے عجمانیوں کو ابھارا کہ وہ نجد میں بغاوت پھیلائیں۔ اور خود ابن سعود کے چند آدمیوں کو جو کسی کام سے کویت گئے ہوئے تھے اپنے پاس قید کرلیا۔ اس طرح ان دونوں میں کھلی مخالفت ہوگئی۔

اسی کے ساتھ ابن سعود اور حسین میں تن گئی۔ جب انگریزوں نے ترکوں کو بھگا دیا تو حسین کا اثر بڑھ گیا اور وہ اپنے کو "ممالک عرب کا شہنشاہ" جتلانے لگا اور ابن سعود کو بھی لکھ بھیجا کہ وہ اس کی حکومت کو تسلیم کرے اور قبائل عتیبہ پر سے اپنا تسلط اٹھالے۔ ابن سعود اس خط کو پڑھ کر آگ بگولا ہوگیا۔ لیکن وقت ایسا نازک تھا کہ فوراً اس کا جواب، جنگ سے نہ دے سکا کیونکہ اب اسے دو قوتوں سے نبٹنا تھا، ایک سلیم، دوسرے حسین۔ اسی لیے اس نے وہابی ملاؤں کو عتیبہ روانہ کیا کہ وہ آل عتیبہ کو حسین کے خلاف اچھی طرح سے آمادہ کریں۔ ملاؤں کو اس میں کامیابی ہوئی، خرما کا سردار لوری کی حسین سے پہلے ہی ناچاقی ہوچکی تھی، قبائل پر اس کا اچھا اثر تھا، اس نے ان کو حسین کے خلاف بہت جلد بھڑکا دیا اور حسین کے نمائندے کو نکال کر ابن سعود کی سیادت قبول کرلی۔

خرما مشہور، زرخیز اور تجارتی شہر تھا، یہاں نجد کے بدوی حجازی تاجروں سے لون اور بکرے تبادلہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس طرح سے یہ حجاز کی کنجی تھی، علاوہ ازیں حجاز کو جانے والی سڑکیں بھی ادھر ہی سے

تھیں، جدہ کے لیے بھی یہی راستہ تھا، مکہ اور طائف کو بھی اسی سے گذر کر جانا پڑتا تھا۔ حسین کسی قیمت پر بھی اس شہر کو اپنے دشمنوں کے حوالے نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فوراً آٹھ سو سپاہیوں کو اسے واپس لینے کے لیے روانہ کیا۔ خرما کے باشندے بڑے بہادر تھے، انہوں نے چوطرف سے حسین کے سپاہیوں کو گھیر لیا اور خوب مار پیٹ کرکے بھگا دیا

تمام نجد میں ایک دھوم مچ گئی اور بچہ بچہ حسین کا مخالف ہوگیا۔

"شریف حسین ہی ہمارا دشمن ہے، وہ بے دین ہے، کتنی سبکی کی بات ہے کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کا والی ہے، وہ باغی اور غاصب ہے۔ یہ بڑے غضب کی بات ہوگی کہ ہم سچے مسلمانوں پر حملہ کرکے بغیر سزا پائے چلا جائے۔ اے عبدالعزیز اٹھ اور ہماری رہبری کر۔"

ابن سعود نے جواب دیا "ہاں یہ سچ ہے، حسین اور مکہ والے مشرک ہوتے جا رہے ہیں .... لیکن امورِ سلطنت کا لحاظ کرتے مجھے کچھ انتظار کرنا چاہیے۔"

(۳)

ابن سعود کی غیرت، اس کی خواہش اور رعایا کا اصرار اسے حسین پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر رہا تھا لیکن فلبی کی وجہ سے مجبور تھا کیونکہ اس سے غیر جانبداری کا وعدہ ہوچکا تھا اور حسین بھی انگریزوں کا حلیف تھا، انگریزوں نے بجائے حسین کے ابن رشید پر حملہ کرنے کی صلاح دی کیونکہ وہ ترکوں کا حلیف تھا، اسی طرح سے بل ہے دن نے دمشق پر دھاوا

بولنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ابن سعود اتنا غیر سنجیدہ تو نہ تھا جوان کی باتوں میں آجاتا۔ وہ اپنی حدود سے اچھی طرح واقف تھا۔ کچھ جواب دینے کی بجائے وہ خاموشی کے ساتھ سوچتا رہا، تمام گرما کا زمانہ اسی الجھن میں کٹا اور کچھ طے نہ کرسکا۔ کیونکہ اگر حسین پر حملہ کرتا تو انگریزوں سے معاہدہ ٹوٹ جاتا، اور انگریز دشمن ہوجاتے، وہ خواہ مخواہ انگریزوں کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ترک نزع کی حالت میں ہیں اور جنگ عظیم میں انگریزوں کو فتح ہونی بدیہی ہے۔

وہ اسی الجھن میں تھا کہ حسین نے خرما پر ایک دفعہ اور چڑھائی کردی لیکن اس دفعہ بھی اسے شکست ہوئی، لوی نے ابن سعود سے امداد طلب کی لیکن ابن سعود اپنی فوج نہ بھیج سکا بلکہ اس نے حسین کو ایک خط لکھ بھیجا۔ حسین نے اس خط کو بغیر کھولے حقارت سے واپس کر دیا اور قاصد سے کہا کہ وہ ابن سعود سے جاکر کہدے کہ حسین، تمام عرب ممالک کا شہنشاہ، عنقریب ریاض پر حملہ کرکے مشرکین کا منہ کالا کرنے والا ہے۔

ریاض میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص حسین کے خلاف تیار تھا، عبدالرحمٰن، مشیران سلطنت، علماء، شیوخ اور الاخوان سب کے سب حسین پر حملہ کرنے کے لیے ابن سعود کو مجبور کر رہے تھے مگر انگریز اسے برابر روکے جا رہے تھے۔ انگریز اس وقت ایک زبردست چال چل رہے تھے، ابن سعود کا زور گھٹانے کے لیے ادھر تو انہوں نے اس سے معاہدہ کرلیا اور اُدھر حسین کو روپیہ بھرنے لگے۔ اس طرف رشید پر

حملہ کرنے کی صلاح دی۔ اُس طرف سلیم کے ذریعہ اسے مدد پہنچائی۔ ابن سعود اس چال کو سمجھ نہ سکا اور اپنے معاہدہ کی پابندی میں نقصان پر نقصان اٹھاتا گیا۔

بالآخر ابن سعود کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا۔ وہ اس جنجال سے سخت ناراض تھا۔ ایک موقعہ پر فلبی سے خوب بحث ہو گئی، ابن سعود بے صبری کے ساتھ زمین پر لکڑی مار مار کر کہنے لگا۔

"واللہ، میں ان فضول باتوں سے اپنے آپ کو دق کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے حق ہے کہ اس سرزمین پر خدا کے خوف سے مرتے دم تک حکومت کروں۔"

یہی اس کا فلسفۂ زندگی تھا۔

فلبی ابن سعود کو ہمیشہ حسین کی مخالفت سے روکتا رہا بلکہ ہر دفعہ رشیدیوں پر حملہ کرنے کی صلاح دی۔ ایک دفعہ ابن سعود نے تنگ آ کر فلبی سے کہا۔

"چو طرف سے انگریزوں کے حلیف مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ خدا ان کو دیکھے۔ میں بھی انگریزوں کا حلیف ہوں، پھر بھی وہ مجھے دھمکی دیئے جا رہے ہیں، لیکن فلبی یاد رکھو، اگر انگریزوں نے میری حفاظت نہ کی تو کوئی پرواہ نہیں، میں ان کے حلیفوں سے خود نبٹ لونگا۔"

اس اثناء میں ابن سعود کی صحت کچھ جواب دے چکی، اس کی خود اعتمادی اور جوش میں بھی ذری سی کمی ہو گئی۔ عوام میں کسی قدر بدلی

پھیل گئی کہ ابن سعود کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ حسین نے ایک مرتبہ اور خرما پر چڑھائی کی لیکن فوج اس دفعہ بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ حسین خرما کو فتح کرنے کے لیے ایک زبردست فوج روانہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ خرما کی رعایا نے اس کے پاس مسلسل پیغام بھیجے لیکن سب لاحاصل آخر میں انہوں نے مجبور ہو کر طنزیہ انداز میں یہ لکھ بھیجا۔

"اے عبدالعزیز، اگر تجھے دنیا کی دولت جمع کرنے کی خواہش ہے اور تو اسی لیے ہماری امداد کو نہیں آنا چاہتا تو ہمیں صاف صاف کہہ دے۔ ہم تجھے معاف کرتے ہیں۔ ہم نے تیری امداد کے لیے ہمیشہ اپنے آدمی روانہ کیے لیکن ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب کی دفعہ ہم عورتوں کو روانہ کریں گے تاکہ نجدیوں کو غیرت دلا کر وہ ہماری امداد کے لیے آمادہ کر سکیں۔"

جب اس خط کا حال نجدیوں کو معلوم ہوا تو ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ علماء نے عام جلسوں میں ابن سعود پر اعتراضات کی بوچھار کرنی شروع کر دی، ریاض کے بلند پایہ شیخ شیخ عبدالوہاب نے ابن سعود پر یہ الزام لگایا کہ وہ اسلام سے ہٹ کر مسلمانوں کو نظر انداز کر رہا ہے، انگریزوں کا دوست ہے اور جیسا کہ خرما والوں نے لکھ بھیجا وہ ہمیں تباہ و برباد کر کے اپنا خزانہ بھرنا چاہتا ہے۔ وہابی نہیں چاہتے تھے کہ انگریز ان کے ملک میں آ گھسیں۔ اب تو وہ اور بگڑے حتیٰ کہ ملازمین نے بھی مقاطعہ شروع کر دیا۔ درویش نے

"الاخوان" کو جنگ کے لیے تیار کر دیا اور یہ کہدیا کہ اگر ابن سعود کو جنگ میں کچھ تامل ہے تو پھر ہم خود حسین کو دیکھ لینگے۔ شمر یا والوں کی مدد کرینگے اور مکہ پر قبضہ جمائینگے۔ اسی دوران میں اطلاع آئی کہ حسین، رشید اور سلیم سے اتحاد کر کے متفقہ طور پر نجد پر حملہ کرنا چاہتا ہے، سلیم عجمانیوں سے مل رہا ہے اور رشیدی قبائل شمر کو لالچ دے کر اپنا ہم نوا بنا رہے ہیں۔

(۴)

ان حالات نے ابن سعود کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے فوراً جنگ کا تصفیہ کر لیا۔ کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچنے کے باعث، زندگی اس پر بار گذر رہی تھی اور اسی بوجھ سے وہ دبا جا رہا تھا، لیکن جب اس نے دل میں تصفیہ کر لیا تو اسے یکسوئی ہو گئی اور اب پھر وہ

پہلے کا ابن سعود تھا

ابن سعود نے اس جوش میں عقلمندی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس نے انگریزوں سے اسی طرح دوستی قائم رکھی بلکہ ان سے وعدہ لیا کہ سلیم اور حسین کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں۔ اس کے بعد اپنے بیٹے ترکی کو دویش کی معیت میں قبیلہ شمر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

علماء فی الحال رشیدیوں پر حملہ کرنے کے مخالف تھے اور حسین کو اس کے کرتوت کا جواب دینا ضروری سمجھتے تھے۔ ابن سعود نے ان کی تشفی کے لیے علماء کی تفہیم کی اور بتلایا کہ رشیدی اہل نجد کے دشمن ہیں، پہلے بھی وہ مخالف تھے اور اب بھی مخالف ہیں، ترکوں سے

ان کی خاصی دوستی ہے، وہ دامے، درمے، قدمے اور سخنے ان کی امداد کر رہے ہیں، قبیلہ شمر ہر طرح سے تیار ہے، انہیں صرف ترکی فوج کا انتظار ہے، ورنہ وہ کبھی کے ریاض پر حملہ کر دئے ہوتے۔ ایسے وقت میں ان پر حملہ نہ کرنا اصولی غلطی ہے۔ رہا حسین اور سلیم کا معاملہ، وہ بعد کو دیکھا جائیگا، فی الوقت ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ انگریزوں کے ذریعہ اس کا بندوبست کر دیا جا چکا ہے۔ رشیدیوں سے نبٹنے کے بعد حسین اور سلیم کو سزا دینا کوئی بڑی بات نہیں۔

ابن سعود کا یہ استدلال علماء کے لیے تشفی بخش تھا، اس کے بعد ابن سعود نے قبائل کے سرداروں کے پاس کہلا بھیجا کہ سب کے سب شہر شقرار کے پاس جمع ہو جائیں۔ ہر شخص جنگ کے لیئے تلا ہوا تھا، خوشی خوشی سب جمع ہوئے، اس کے بعد ابن سعود اپنے محافظ دستہ کے ہمراہ اس مقام پر پہنچا اور کہا کہ جنگ ابن رشید اور آل شمر سے ہے۔ یہ سن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ وہ حسین، سلیم اور عجمانیوں کے خون کے پیاسے تھے اور اسی غرض سے آئے بھی تھے۔ "الاخوان" بھی اس بات سے ناراض تھے، قبیلۂ مطیر کے شیخ الدویش نے نمائندہ کی حیثیت سے سامنے آکر ابن سعود سے کھلے الفاظ میں کہا

"ہم حسین یا عجمانیوں سے جنگ چاہتے ہیں، انگریز اسے مدد دیرہے ہیں جس سے ہماری اخوت کو دھکا پہنچ رہا ہے، ہم تو اپنے مذہب کے مخالفین سے جنگ چاہتے ہیں۔ اگر راضی ہو تو بولو۔ ہم

پہلے حسین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یا آلِ عجمان کے؟"

ابن سعود نے بہت ہی سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنیں۔ وہ ان کے دلوں کی حالت سے خوب واقف تھا، وہ یہ شبہ کر رہے تھے کہ ابن سعود کافروں سے مل کر ان کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ اب ابن سعود بڑی مشکل میں تھا، گو یہ مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ سر جھکا کر وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اگر الاخوان ذرا بھی بدل جائیں تو وہ دویش کی سرکردگی میں حسین پر حملہ کر بیٹھیں گے۔ دویش بڑا چالباز تھا اور الاخوان کی قوت اب کافی زبردست ہو چکی تھی۔ ان سے مخالفت کرنا اپنے اثر کو اپنے ہاتھ سے زائل کرنا تھا۔

بہرحال ابن سعود نہایت متانت کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ہاتھ کو آگے بڑھا کر گرجتی ہوئی آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔ اپنے قبائل کی نفسیات سے وہ خوب واقف تھا، ان کو اکسانا، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور پھر تیز ہو کر ڈانٹ دینا، یہ سب اس کے چلتے ہوئے گُر تھے۔ اپنی آواز کو آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"دیکھو، تم میرے سپاہی ہو، سوائے خدا کی قوت کے تمہارے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا کہ میں ان امور سے بے خبر ہوں جن کی ہمیں ضرورت ہے، اور رہا شریف حسین کا، تم اس کے متعلق زیادہ فکر نہ کرو، انگریز اسے خرما پر حملہ کرنے سے باز رکھینگے

یا ـــــ ہاں میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اس کے خلاف حملہ کرونگا۔ اس کی فکر نہ کرو۔ اگر میں اپنے خاندان کے کسی رکن یا ایک غلام ہی کو بھیج دوں تو سارا جنوبی علاقہ شریف کے خلاف اٹھ کھڑا ہوجائیگا۔ اور اب رہا عجمانیوں کے متعلق، تو تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور جو یہ کہتے ہو کہ انگریز اسے مدد پہنچا رہے ہیں، اگر یہ ہے تو پھر انگریز مجھے یہ کیوں کہتے ہیں 'تم نادان ہو' تمہارے پاس ذرائع موجود ہیں، ابھی حائل پر حملہ کردو'؟

"وہ درست کہتے ہیں، میرے پاس حملہ کرنے کے لیے وسائل موجود ہیں اور ان کے باوجود میں تساہل کر رہا ہوں۔ اگر میں حائل پر قبضہ کرلوں تو پھر عجمانی کیا چیز ہیں! اگر میں حاکم ہوجاؤں تو انگریز تمام ریگستانی قبائل کو میری ہی نگرانی میں چھوڑ دینگے اور ہماری سرزمین پر جو لوگ بستے ہیں، ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہ رہیگا"

اس کے بعد جب یہ لوگ رام ہوتے نظر آئے تو ابن سعود نے بتلایا کہ مذہب کے دشمن تو رشیدی ہیں، علماء نے بالاتفاق یہ بات تسلیم کرلی۔ الاخوان جو کچھ دیر پہلے شبہ میں بھرے ہوئے بیٹھے تھے، اب صاف ہوگئے اور جوش میں آکر کہنے لگے۔

"اے عبدالعزیز تو نے ہم پر اس سے پہلے ہی بھروسہ کیوں نہیں کیا، بلاشک وشبہ ہم تیرے ہی لیے لڑتے"

اس طرح پھر ـــــ ایک مرتبہ ابن سعود ان کا قابل اعتماد رہبر

بن گیا۔ اہل قبائل اس کے خیمہ کی اطراف جمع ہوکر اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے لگے۔ شام کو سب لوگ ایک جگہ نماز کے لیے جمع ہوئے، ابن سعود نے امامت کی، اس کے بازو ایک حبشی غلام برہنہ تلوار لیے کھڑا تھا تاکہ کوئی دشمن اچانک حملہ نہ کر بیٹھے۔ نماز ختم ہونے پر ابن سعود نے کہا۔

"ہر شخص اپنے گھر چلا جائے، جنگ کے لیے جلدی سے تیار ہو جاؤ اور اپنے گھروں میں سب چیزیں ٹھیک کر کے چاندرات کو مجھ سے بریدہ پر ملو، خدا مہربان ہے، وہ ہمیں کامیاب کریگا"

ایک ماہ بعد ابن سعود نے حائل کا رُخ کیا۔ مخبروں نے اطلاع دی کہ اس وقت رشیدی موافقت کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ یہ سن کر ابن سعود نے آگے بڑھنا شروع کیا، رستہ میں بنی یطرف کے قبائل تھے، یہ لوگ رشیدیوں کے وفادار دوست اور بذاتِ خود بڑے بہادر تھے، انہوں نے ابن سعود کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا لیکن اس کی منظم فوج نے انہیں پسپا کر دیا۔ اس درمیانی جھگڑے میں جو وقت لگا اس عرصہ میں ابن سعود کی چڑھائی کی اطلاع رشید کو ہوگئی اور وہ قلعہ بند ہوکر محاصرہ کے لیے تیار ہو گیا۔

ابن سعود محاصرہ کو فضول سمجھتا تھا اس کے ساتھی بھی جنگ کے لیے بے چین تھے۔ ایسے میں رشیدیوں نے صلح کی درخواست کی۔ ابن سعود نے اسے قبول کر لیا اور بنی یطرف سے بہت کچھ مال غنیمت حاصل کر کے خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس چڑھائی سے

رشیدیوں اور ترکوں پر خاصہ اثر ہوا، انگریز بھی خوش ہوئے، بسلیم کو بھی بلاواسطہ ایک دھمکی ہوگئی اور اہل نجد اور الاخوان دونوں خوش ہو گئے۔ ابن سعود کی یہ وہ سیاسی چال تھی جس کو دیکھ کر آج کے زمانہ کے بڑے بڑے سیاسی دنگ ہیں۔

دسواں باب

حسین کی شکست

۱

جب ابن سعود سائل سے ریاض کی طرف لوٹ رہا تھا، فلسطین میں
الن بی اور بغداد میں ماڈ ترکوں کی منتشر فوج کو بھگا رہے تھے۔ موصل پر
انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ترک بری طرح پسپا ہوئے۔ بلغاریہ اور
ترکی نے صلح کی درخواست کی۔ آسٹریا نے بھی یہی کیا۔ جرمنی کی سلطنت
خراب ہو گئی اس طرح جنگ عظیم کا خاتمہ ہو چکا۔

اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا شروع ہوا، یہ زیادہ تر جنگ عظیم
کا نتیجہ تھا، زہریلی گیسوں، سڑے مردوں اور طرح طرح کی بدعنوانیوں
کی تحت انفلوئنزا ساری دنیا میں پھیل گیا۔ ملک عرب بھی اس سے
نہ بچ سکا۔ ریاض میں اس کا زور بہت رہا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے

کوئی مردہ نہ نکلا ہو۔ نجد کا ولی عہد ترکی، جو ایک بہادر اور مضبوط جوان تھا، اسی مرض منحوس کا شکار بنا۔ شاہی حرم میں ابن سعود کی محبوب ملکہ جوھرہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

تمام ریاض اپنے مرحوموں پر خون کے آنسو بہا رہا تھا، ابن سعود بھی ان کے ساتھ اپنے غم میں مبتلا تھا، یوں تو اس کی اور بیویاں تھیں لیکن جوہرہ کو وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا، یہ سعودی خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ عام عورتوں کے مقابلہ میں وہ بہت ہی حسین اور ذہین تھی۔ ابن سعود کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ایک دفعہ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا، دو دن تک دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ رہے۔ ابن سعود کو یہ قلیل مدت بھی شاق گذری۔ وہ کسی طرح اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا ہے، جوہرہ کے بغیر اس کی زندگی تلخ تھی۔

ابن سعود نے کئی شادیاں کیں لیکن ان کی تعداد کبھی شرعی احکامات کے دائرہ سے باہر نہیں ہوئی چنانچہ وہ کہا کرتا تھا۔

"میں محمد رسول اللہ صلعم کے احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ہوں اور جو حکم ہے اس پر عمل کرتا ہوں .... میں نے اپنی بیویوں کی تعداد کو کبھی حد شرعی سے متجاوز ہونے نہ دیا"

۱۹۱۷ء میں ایک دفعہ دوران گفتگو میں اس نے بل ہے ون سے سخت تعجب کے ساتھ پوچھا؟

"انگلستان اس قدر روشن خیال ہونے کے باوجود وہاں زنا کے لیے سزا نہیں۔ اس ریگستان میں تو اس کے لیے سنگسار کی جاتی ہے"

بل ے ون نے دریافت کیا

"آپ کے حرم میں کتنی عورتیں ہیں؟"

ابن سعود نے جواب دیا۔

"میں سرکار دو عالمؐ کے حکم کے مطابق چار بیویاں رکھتا ہوں"

"لیکن کتنی عورتوں سے عقد کیا اور کتنوں کو طلاق دی؟"

"میں نے کوئی تنو کے قریب عورتوں سے عقد کیا اور طلاق بھی دی، اگر خدا چاہے تو اور کئی شادیاں کر کے طلاق دونگا"

ایک دوسرے موقع پر ابن سعود نے فلبی سے شادی اور طلاق کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"واللہ میں نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں کیں، اور خدا کے فضل سے اب تک شادیاں کرتا ہوں۔ میں ابھی نوجوان اور مضبوط ہوں۔ اب جنگ کے نقصانات کے بعد یقیناً ایک وقت آئیگا جبکہ یورپ کے لوگ سیکھینگے اور ہر مرد کئی شادیاں کرنے لگیگا"

ابن سعود شریعتِ محمدی کا سختی کے ساتھ پابند تھا اور لوگوں سے بھی اس کی پابندی کرواتا تھا۔ اس کے حرم میں ہمیشہ تین بیویاں رہتی تھیں۔ جب جی چاہتا خالی جگہ کو پُر کرلیتا، لیکن اس کے باوجود اپنی

بیویوں کے ساتھ اس کا سلوک بے حد درجہ مساویانہ تھا۔ کسی کو ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ حرم میں جاتا اور سب سے مساویانہ طور پر ملتا تھا۔

عام طور سے لوگ ابن سعود پر عیاشی کا الزام دیتے ہیں، یہ غلطی ہے۔ بلاشبہ ابن سعود نے کئی شادیاں کیں لیکن اس کے کئی وجوہ تھے اس نے مختلف قبائل کے سرداروں کی لڑکیوں سے اس لیے عقد کیا کہ ان سے تعلقات مضبوط ہو جائیں۔ عبدالوہاب کے خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے کی غایت مذہبی پیشواؤں کو خوش کرنا تھا۔ اسی طرح اس کی شادیوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ طلاق کی تعداد بھی اسی کے لگ بھگ رہی یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ طلاق دینے سے عام بددلی پیدا ہوگئی ہوگی لیکن عرب میں طلاق دینا کوئی مذموم فعل نہیں سمجھا جاتا بلکہ عرب ابن سعود کو اپنی لڑکی دینا فخر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مطلقہ عورتوں کے ساتھ اس کا سلوک نہایت اچھا ہوتا تھا، وہ نہ صرف ان کی روپیہ پیسہ سے امداد کرتا بلکہ ان کے لیے اچھے شوہر بھی فراہم کر دیتا تھا، اگر ان کے بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو اس کی نگرانی کا ذمہ دار خود ہوتا تھا۔

اس طرح سے ابن سعود نے کئی شادیاں کیں، کبھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے، کبھی قبائل سے اتحاد پیدا کرنے اور کبھی کسی غریب مگر شریف خاندان کو ترقی دینے کے واسطے۔ لیکن ان سب میں وہ جوہرہ کو بہت چاہتا تھا، ترکی اور جوہرہ کی موت اس کے لیے ایک سانحہ عظیم

تھی۔ ایک سال تک وہ اسی غم و اندوہ میں مبتلا رہا۔ محل میں اس نے جوہرہ کے کمروں کو بند کروادیا اور جہاں کی چیزیں وہیں رکھی گئیں۔ ان کمروں میں سوائے نورہ کے کسی دوسری عورت کو داخلہ کی اجازت نہ تھی۔ ابن سعود نے جوہرہ کے ملازموں اور غلاموں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ان کے ساتھ اس کا برتاؤ اتنا عمدہ تھا کہ وہ اپنی ملکہ کا رنج بھول گئے۔ جمعہ کے دن ابن سعود، فجر کی نماز کے بعد، ریاض کے بڑے قبرستان کو فاتحہ کے لیے جاتا تھا جہاں جوہرہ دفن تھی۔

(۲)

ابن سعود کا غم ابھی پوری طرح غلط نہ ہونے پایا تھا کہ اسے جنگ کے لیے فوراً تیار ہونا پڑا۔ حسین کا بیٹا، عبداللہ خرما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابن سعود نے اس دفعہ خرما کی طرف داری کا تہیہ کر لیا کیونکہ سفرا پر اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اب کی دفعہ خرما پر حملہ ہوا تو وہ ان لوگوں کی تائید کریگا۔ اس مرتبہ ابن سعود کو مدافعت یا مقابلہ کے لیے زیادہ جدوجہد کرنی نہیں پڑی کیونکہ اہل عرب حسین کے سخت مخالف ہوگئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس نے عرب کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اس لیے قبائل جوق در جوق اس کی امداد کو آنے لگے۔

اب حسین اور ابن سعود دونوں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ حسین نے کھلم کھلا جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن ابن سعود نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتا گیا تاکہ حسین مغالطہ میں رہے۔ انگریزوں نے

عرب کے حالات پر غور کرنے کے لیے قاہرہ میں ایک کانفرنس منعقد کی
حسین جنگ کے زمانہ میں ان کا یار وفادار تھا، صلح کے زمانہ میں بھی
وہ ویسا ہی رہا، انگریز ابن سعود کو اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے، ان کے نزدیک
اس کی حیثیت ایک بااثر شیخ کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے خیال
کیا کہ ابن سعود کو مشین گن، رائفل، انگریزی باقاعدہ فوج وغیرہ سے آسانی
کے ساتھ شکست دی جاسکتی ہے اس خیال سے کانفرنس نے حسین کو
امداد دینے کا تصفیہ کیا اور ساتھ ہی ابن سعود کو حکم دیا کہ وہ واپس
چلا جائے اور خرما حسین کو واپس کردے ورنہ امداد بند کر دی جائیگی۔

اس تحکمانہ انداز سے ابن سعود کی غیرت کو ٹھیس لگی، وہ محض اپنے
وعدہ کی بناء پر انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور حسین پر حملہ نہیں کرنا
چاہتا تھا حالانکہ "الاخوان" اس معاملہ میں اس سے بدظن بھی ہوگئے۔
اب انگریزوں نے جو اس طرح کی دھمکی دی، تو اسے بھی غصہ آگیا۔
اسے اپنے خدا پر کامل بھروسہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خدا کی قوت سب سے
بالا و برتر ہے اگر انگریزوں نے امداد روک دی تو کیا ہرج ہے، خدا
مسبب الاسباب ہے، وہی مدد کریگا۔

(۳)

انگریزوں کی امداد کے ساتھ، عبداللہ چار ہزار سپاہیوں کی
باقاعدہ فوج اور دس ہزار بدویوں کے ساتھ، جدید آلات حرب سے
مسلح، خرما کی طرف بڑھا اور ترابہ پر قیام کیا۔ ابن سعود نے بھی

سفنہ کے چشموں کے پاس پڑاؤ ڈال دیا۔ خرما کا عامل لوئی بھی اپنے پیر پر کھڑا ہوگیا۔ خرما میں "الاخوان" بھرے پڑے تھے۔ مخبروں نے اطلاع دی کہ عبداللہ تراآبہ کے نخلستان میں، بے فکری اور اطمینان سے پڑا ہوا ہے۔ مئی کا آخری مہینہ تھا، چاندنی بھی نہ تھی، لوئی نے اس موقع کو غنیمت جان کر، اپنے الاخوان کی فوج کے ساتھ رات کی تاریکی میں دشمن پر حملہ کردیا، سپاہی سو رہے تھے، عہدہ دار خیموں کے اندر آرام کر رہے تھے۔ الاخوان نے یک دم تلوار چلانی شروع کردی۔ بدو منتشر ہوکر بھاگنے لگے۔ الاخوان نے رائفل، مشین گن، خیموں وغیرہ سب پر قبضہ کرلیا۔ عبداللہ یہ حال دیکھ کر فوراً اپنے خیمہ سے باہر نکلا اور اسی لباس سے گھوڑے پر بیٹھ کر مکہ کا رُخ کیا اور محل میں پہنچ کر سارا قصہ اپنے باپ کو سنایا۔

حسین کی فوج کا خاتمہ ہوگیا۔

جیسی ہی یہ خبر عام ہوئی طائف والوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ مکہ اس وقت بیرونی ممالک کے زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ بیچارے بدحواس ہوگئے اور جدہ کی طرف چل نکلے۔ وہابیوں اور الاخوان کا خوف تمام حجازیوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ حسین بڑے مضبوط دل کا آدمی تھا۔ اس نے عبداللہ کو لعنت ملامت کی اور انگریزوں کو فوری امداد کے لیے لکھ بھیجا۔

ابن سعود نے اس دفعہ کچھ نہ کیا بلکہ اس کے بے قاعدہ الاخوان

ہی نے دشمن کو مار بھگایا۔ وہ فتحمندانہ انداز میں ترابہ میں داخل ہوا۔ مکہ جانے میں اب اسے کوئی چیز حائل نہ تھی۔ حسین اور سارا حجاز اس کے رحم وکرم پر تھا۔

ابن سعود اب مکہ کا رُخ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن حسین کی ایما سے انگریزوں نے ابن سعود کو واپس جانے کی دھمکی دی، چاہتا تو ابن سعود فوراً مکہ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیتا اور حسین کو شکست دے کر بدلہ لے سکتا۔ حجاز کی فتح اب اس کے لیے مشکل نہ تھی۔ الاخوان بھی تلے ہوئے تھے، مشیروں نے بھی یہی صلاح دی لیکن ابن سعود اب بہت سنجیدہ ہوگیا تھا، ایسے وقتوں میں عارضی فتح وکامرانی کے گھمنڈ میں آپے سے باہر ہونا، اس کی طبیعت کے خلاف تھا، وہ واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس وقت انگریزوں سے لڑائی مول لینی قرین مصلحت نہیں۔ کیونکہ ایک تو انگریز زبردست تھے اور دوسرے جنگ عظیم میں انہوں نے فتح پائی تھی اور مشرق کے ایک بڑے حصہ پر ان کا قبضہ تھا۔ ان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

ان سب چیزوں کو اس نے اپنے لوگوں کے آگے پیش کیا اور سمجھایا کہ کافی مال غنیمت ہاتھ آچکا ہے، کئی مہینوں کی بے فکری ہوگئی ہے، ایسے میں خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ سبھوں نے اس کی صلاح کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد ابن سعود نے خراسان

اپنی تھوڑی فوج چھوڑ دی اور عتبہ والوں سے اطاعت کا بچن لے کر
ریاض کی طرف کوچ کیا اور ایک دوسری سوچ میں پڑ گیا کہ ترک تو
عرب سے نکل چکے، اب انگریز اپنے قدم جما رہے ہیں۔

گیارھواں باب

حائل کی فتح اور سلطانِ نجد

(۱)

حسین کو شکست دینے کے بعد ابن سعود کے حوصلے بہت بلند ہو گئے، لیکن انگریزوں کا ہاتھ ایسا تھا کہ وہ ایک گہرے فکر میں پڑ گیا۔ انگریز بظاہر ریگستان پر قبضہ کرنا تو نہیں چاہتے لیکن اس پر حکومت کرنے کی نیت ضرور تھی اور اس لیے وہ حسین کے دوست بن کر عرب میں اپنے قدم جما رہے تھے۔ ابن سعود ترکوں کا سرے سے مخالف تھا۔ وہ تو خیر چلے گئے لیکن اب انگریزوں کا سوال پیچیدہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک تو جنگ عظیم میں فتح یاب ہونے سے ان کی قوت بڑھ گئی تھی اور دوسرے شام، فلسطین، حجاز، یمن، عسیر اور مصر انہی کے ہاتھ میں تھے۔ ابن سعود کو وسط عرب پر

حکمران تھا تاہم وہ مٹھی بھر آدمیوں کی بے قاعدہ فوج سے انگریزوں سے کیا مقابلہ کر سکتا؟ اسی لیے سنجیدگی سے اس نے مڈبھیڑ نہیں کی، اور جہاں تک ہو سکے ان سے مل ملا کر کام نکالنا ہی مناسب سمجھا۔

انگریزوں کے ہاتھ میں اب بہت سے وسیع مگر منتشر علاقے تھے۔ ان کے پاس اتنی فوج نہ تھی جو ہر مقام پر متعین کی جا سکتی۔ نیز جنگ عظیم میں لڑتے لڑتے انگریزی فوج تنگ آ چکی تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے لیے یہ دقت طلب مسئلہ بن گیا کہ آیا عرب کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے فوج رکھی جائے یا کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جائے کہ جس سے آسانی کے ساتھ مقصد نکل آئے۔ انگریز مدبرین، عرب پر خواہ مخواہ اپنا روپیہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے صلاح دی کہ شام کی انقلابی انجمن کے سلسلہ میں "عرب اتحاد" قائم کر کے اس کی صدارت حسین کو دی جائے۔ حسین چونکہ حجاز کا والی ہے اور مسلمان اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس طرح سے ہمارا مسلمانوں پر اچھا اثر قائم ہو جائیگا اور اگر حسین کو خلیفہ بھی بنا دیا گیا تو ہندوستان کے مسلمان ہمارے ہاتھ میں آ جائینگے۔

بادی النظر ہی یہ اسکیم بہت سادہ اور سود مند معلوم ہوئی لیکن اصل میں یہ ایک ہوائی پل تھا، واقعات اس کے منافی تھے کیونکہ "عرب اتحاد" کا قیام سرے سے ناممکن تھا، ہو تو کیسے؟ نہ کوئی

عرب قومیت ہی کا وجود تھا اور نہ اہل عرب حسین کو اپنا سردار تسلیم کرنے تیار رہے تھے۔ اس کے علاوہ حسین کے لڑکوں میں علی اور زاہد بہت ہی معمولی دل و دماغ کے انسان تھے البتہ عبداللہ کسی قدر اہل تھا مگر رویہ کچھ مشتبہ۔ مزید برآں حسین صرف زمانہ ساز تھا، گو بہادر سہی مگر "عرب اتحاد" کے بوجھ کو سنبھالنا اس کے امکان سے باہر تھا۔

اب رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمان حسین کی حکومت سے خوش ہو گئے تو یہ بھی ناممکن تھا، دنیاوی عیش و آرام اور حکومت کی خاطر انگریزوں سے مل کر ترکوں کا یعنی برادران اسلام کا خون بہانا، ایک ایسا فعل تھا جسے کسی خطہ کے مسلمان بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

انگریز مدبرین نے ان حالات پر بہت غور و خوض کیا۔ اور اکثروں نے اس اسکیم کی مخالفت کی اور اپنے اصولی استدلال پیش کیے۔ لیکن کرنل ٹی، ای لارنس اس اسکیم کی موافقت میں تھا اور اسے قابل عمل تصور کرتا تھا۔ سینٹ جان فلبی عرب کے حالات اور بالخصوص ابن سعود کی اہمیت سے واقف تھا۔ اس نے اس اسکیم کی سرے سے مخالفت کی لیکن ٹی۔ ای لارنس نے ایک نہ سنی۔ انگریزوں کو لارنس پر بہت کچھ بھروسہ تھا، انہوں نے "عرب اتحاد" کے قیام کا تصفیہ کر لیا۔

ابن سعود اس وقت ریاض میں تھا۔ یہ اطلاعیں جب اس کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے دمشق میں اپنے نمایندے بھیجے تاکہ وہ صحیح واقعات سے مطلع کریں۔

ابن سعود کو اطلاع ملی کہ ابن رشید، حسین اور سلیم سب کے سب انگریزوں سے امداد لے کر اس پر ٹوٹ پڑنے والے ہیں۔ انگریزوں کی ایما سے فیصل دمشق کا حکمران بھی مقرر ہو گیا۔ یہ حالات دیکھ کر ابن سعود نے انگریزوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ اب پہلے کی طرح اس کے دوست ہیں یا نہیں۔ انگریزوں نے ۱۹۲۰ء کے اواخر میں بغداد کے ہائی کمشنر سر پرسی کاکس (Sirpercycox) کو ابن سعود کے پاس روانہ کیا۔ عجیر پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن اس سے ابن سعود کو کچھ تشفی نہ ہوئی۔

اب ابن سعود کے اطراف دشمن ہی دشمن تھے۔ احساء کے علاوہ تمام ساحلی علاقے دشمنوں کے ہاتھ میں تھے۔ ابن سعود چاہتا تھا کہ دشمنوں کے اس جتھے کو توڑ دے اور یہ اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل بھی نہ تھا لیکن بڑی دقت یہ تھی کہ ان تینوں میں ابن سعود جس کسی سے لڑتا انگریز اس کا ساتھ دیتے اور یہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ ایسے نازک وقت میں اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اس کے ہوش پران ہو جاتے اور چپکے سے وہ بھی انگریزوں کے سایہ عاطفت میں آجاتا۔

لیکن ان پریشان کن حالات کے باوجود ابن سعود کے ہاتھ سے استقلال کی باگ نہ چھوٹی۔ وہ ہر ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ اور ہر مصیبت کو راحت کی منادی سمجھتا تھا!

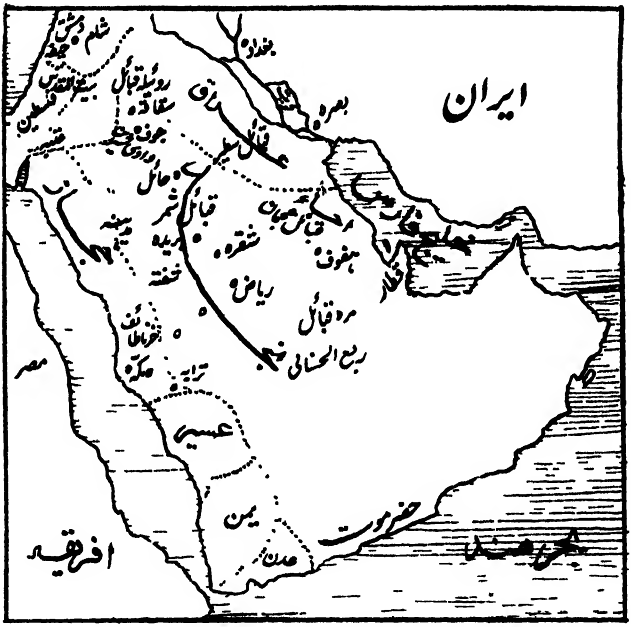

(۴)

ابن سعود واقعی قسمت کا دھنی تھا۔ اسے خدا پر کامل بھروسہ تھا اور ہر مصیبت اور راحت میں وہ خدا کی یاد کو دل سے نہ بھلاتا تھا۔

خدا نے آڑے وقتوں پر اس کی امداد کی اور وہ کامیاب بھی رہا۔ چنانچہ جب ہر طرف سے اسے مایوسی ہوگئی تو ۱۹۲۱ء میں اسے ایک بہترین موقع ہاتھ آیا۔ اس کے حریفوں میں سب سے زیادہ کمزور حالت رشیدیوں کی تھی۔ ابن سعود نے بنی شمر کے پاس اپنے ملّا اور مبلغ روانہ کیے کہ ان کو رشید کے خلاف اکسایا جائے۔ یہ مذہبی پیشوا نہایت جرأت کے ساتھ بلاخوف و خطر تبلیغ کرنے لگے۔ شمری ان پر اعتقاد لا کر ساتھ ہو گئے۔ اور اس طرح شمریوں کی قوت بٹ گئی۔ اسی اثناء میں ابن رشید کا بھی انتقال ہوگیا اور اس کے ورثاء اقتدار و حکومت کے لیے ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے لگے۔ ادھر رشیدیوں کا یہ حشر ہوا اور ادھر سلیم کا انتقال بھی ہوگیا۔ اس کا لڑکا احمد بالکل نااہل تھا۔ یہ سب باتیں ابن سعود کے حق میں مفید ثابت ہوئیں اور اسے اپنے اقتدار کے دائرہ کو وسیع کرنے کا کافی موقع مل گیا۔ بنی شمر میں اب دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک ابن سعود کے موافق اور دوسرا خلاف۔ مخالف گروہ نے حسین سے امداد کی درخواست کی۔ لیکن حسین خود اپنے معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ وہ انگریزوں کے برتے پر کود رہا تھا لیکن انگریز خود اپنے معاملات میں اس قدر سرگرداں تھے کہ انہیں کچھ دیر کے لیے حسین پر سے اپنی توجہ ہٹا لینی پڑی۔ عراق میں بغاوتیں ہو رہی تھیں، مصر اور ہندوستان میں ایک ہڑبونگ

مچی ہوئی تھی۔ یہ واقعات انگریزوں کے لیے بہت زیادہ اہم تھے اور ان کی توجہ فی الوقت انہی پر مرکوز تھی۔

اندھا کیا چاہیے ؛ دو آنکھیں۔ ابن سعود کے لیے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا ؛ میدان خالی تھا۔ ابن سعود نے جنگ کا اعلان کر دیا اور دویش کی معیت میں دو ہزار "الاخوان" کو قبیلۂ شمر پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا، الاخوان کی ایک اور جماعت کو دیگر قبائل کی فراہمی کے لیے بھیجا۔ سب لوگ خوشی خوشی جمع ہونے لگے، انہیں اونٹ اور ہتھیار تقسیم کر دیے گئے۔

جب ابن سعود روانگی کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا تو اسے اطلاع ملی کہ بنی شمر نے الاخوان کا جوانمردانہ مقابلہ کیا اور دویش کو انہیں شکست دینے میں بڑی دقت اٹھانی پڑی۔ اس لڑائی میں بریدہ کا عامل فہد اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

یہ سن کر ابن سعود اپنی فوج کو بہت تیزی کے ساتھ تیار ہونے کا حکم دیا اور جب سب فوج تیار ہو گئی تو دوسرے ہی دن صبح کو ابن سعود کا قافلہ روانہ ہوا۔ ریاض کا علمبردار مطرف، سب سے سامنے ابن سعود کا سبز و سفید جھنڈا لیے ہوا تھا۔ اسی کے پیچھے ابن سعود اپنے زبردست اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے اس کا ۱۹ سالہ لڑکا سعود تھا۔ اطراف میں نجد کے ایک ہزار جنگجو محافظ دستہ کے طور پر ان کے ہمرکاب تھے۔ سیدھی جانب الاخوان اور

بائیں جانب دو اسیر۔ ان کے پیچھے شہریوں اور دیہاتیوں کا ایک جمِ غفیر اپنے اپنے سرداروں کی سرکردگی میں۔ جزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

قبیلۂ شمر کے لوگ بلاشبہ بڑے بہادر اور جنگجو تھے لیکن ان کا کوئی مستقل رہبر نہ تھا جس کی وجہ سے وہ باقاعدہ حملہ سے مجبور تھے۔ حسین اور فیصل نے اس موقع پر ان کی فدی بھی مدد نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ابن سعود حائل پہنچا کسی نے اس کی مدافعت نہ کی انہوں نے شہر میں بلا کھٹکے داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے حائل میں ایک فوجی دستہ چھوڑ دیا اور خود شمری قبائل کو مزہ چکھانے کے لیے آگے کی طرف روانہ ہوا۔ شمری قبائل کے بعض لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اکثر عراق کی طرف بھاگ نکلے۔ جن لوگوں نے اس کی حکومت تسلیم کی ان کے ساتھ ابن سعود نے بہت اچھا برتاؤ کیا۔ رشیدی خاندان کے پسماندوں کو ریاض بھیجدیا اور وہاں ان کے رہنے کے لیے مکان اور کام کاج کے لیے غلام دیے۔ ابن رشید کی بیوہ سے خود عقد کر لیا۔ اس کے بچوں کی پرورش بھی اپنے ذمہ کر لی اور اس طرح رشیدی خاندان سے رشتہ جوڑ لیا۔

ابن سعود کی یہ کامیابی بہت ہی شاندار تھی۔ اس سے اس کی شخصیت مسلم ہو گئی، دشمنوں پر اچھا اثر بیٹھا اور انگریزوں نے بھی

اسے محسوس کیا۔ جب ابن سعود ریاض واپس آیا تو عبدالرحمٰن مبارکباد دینے کے لیے شہر سے باہر آیا۔ تمام شہری اس کے پیچھے تھے۔ عبدالرحمٰن پھولوں نہیں سمارہا تھا کیونکہ ایک مدت کے بعد اس کی دلی تمنا آج پوری ہوئی تھی۔ رشیدی خاندان کو شکست دے کر حائل پر حکومت کرنا، عبدالرحمٰن کی انتہائی آرزو تھی۔ اور آج اس کے سعادتمند لڑکے نے باپ کی خواہش پوری کی تھی پھر وہ کیوں اس پر نازاں نہ ہو؟

دوسرے دن ایک شاہی دربار ہوا۔ علماء، قبیلوں کے سردار اور دیگر اکابر سلطنت جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے اس جلسہ کی صدارت کی اور ابن سعود کو

سلطان نجد

کا خطاب دیا۔

بارھواں باب

مکّہ کی فتح

(۱)

حائل کے شمال میں شام اور فلسطین کی سرحد تک عظیم الشان کھلے میدان پڑے ہیں۔ یہ میدان قبائل شمر اور رویلا کے زیرِ تصرف تھے اور وہیں وہ اپنے جانور چرایا کرتے تھے۔ ان میدانوں کے وسط میں، ریاض سے کوئی سات سو میل شمال کی طرف جوف اور سقاقہ کے سرسبز و شاداب نخلستان ہیں۔ ان کے پہلوؤں سے وادیٔ شیریں گذرتی ہے۔ اس وادی کی لمبائی ڈھائی سو میل کے قریب ہے، اور اس کے اطراف کئی چھوٹے بڑے گاؤں آباد ہیں۔

ابن سعود نے اپنے لوگوں کو ان میدانوں کی طرف روانہ کیا۔ اس کے فرستادہ ملّا اہل قبائل کو اپنا معتقد بنا رہے تھے اور

الاخوان جوش میں آ آ کر آگے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ قبائل روئیلا نے کچھ بھی مخالفت نہیں کی کیونکہ ان کا کوئی سردار نہ تھا، نوری سہیلان بوڑھا ہو گیا تھا اور دمشق جا کر فرانسیسیوں کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گذار رہا تھا۔ البتہ اس نے اپنے پوتے کو الاخوان کی مقابلہ کے لیے بھیجا جو پسپا ہو کر واپس چلا گیا۔ جوف اور شقاقہ کے عاملوں نے جب یہ حالت دیکھی تو چپکے سے ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے گاؤں نے بھی ابن سعود کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا۔ اس طرح سے الاخوان اپنی فتوحات کا علم بلند کرتے ہوئے فلسطین کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔

اب تو ان حالات کو دیکھ کر انگریزوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ جوف اصل میں شمالی ریگستان کی کنجی تھی۔ یہی بدویوں کا مرکز تھا، مصر، بغداد اور شام و خلیج فارس کے درمیان یہی ایک عمدہ رستہ تھا اور یہ ایسا مرکزی مقام تھا کہ جس کسی کی وادئ شیریں پر حکومت ہوتی وہ شام، فلسطین اور شرق اردن پر اطمینان سے دباؤ ڈال سکتا تھا۔

انگریز سمجھ گئے کہ ابن سعود ان کے لیے خطرناک ہوتا جا رہا ہے اور اگر اب بھی اسے نہ روکا گیا تو یقیناً اس کا دائرہ اثر وسیع تر ہو جائیگا۔ انگریزوں نے اس غرض سے فوراً ابن سعود سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اسے کانفرنس میں آنے کی دعوت دی۔

ابن سعود کے مشیر الاخوان کی طرح جوشیلے تھے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں سے ملنا ملانا فضول ہے انگریز کچھ نہیں کرسکتے۔ ترک اور افغان ان پر چڑھائی کررہے ہیں، ہندوستان میں بھی بدامنی پھیلی ہوئی ہے اور خود انگلستان خانہ جنگیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں انگریزوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ سب سنی سنائی خبریں تھیں۔ ابن سعود کے مشیر اور الاخوانی جوش میں آکر معاملہ فہمی اور سنجیدگی سے دُور ہو گئے تھے۔ لیکن ابن سعود اب ایک بڑا مدبر اور سیاس ہو گیا تھا۔ وہ ان حالات کو سب سے بہتر جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انگریزوں کی قوت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی، اور یہ کہنا کہ انگریز کمزور ہو رہے ہیں، ایک بے بنیاد حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے ابن سعود نے انگریزوں سے گفت و شنید کرنے کا تہیّہ کرلیا اور کانفرنس میں اپنے نمایندے بھی روانہ کیے۔

ابھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کوئی ڈیڑھ ہزار الاخوانی نوجوان ابن سعود کو اطلاع دیے بغیر خُتقرہ سے نکلے اور حائل ہوتے ہوئے شمال میں کوئی ایک ہزار میل تک آگے نکل گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے شہر توریب کو لوٹ لیا اور عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں سب کو ایک ساتھ قتل کر ڈالا۔ ان کا یہ طرزِ عمل ریگستانی جنگ کے خلاف تھا کیونکہ جنگ صرف جنگجوؤں کے لیے

ہے کہ سب کے لیے۔ لیکن الاخوانی مذہب کے اندھے تھے چونکہ توریبی ان کے عقائد کے خلاف تھے اس لیے یہ بھی قدیم دستور اور رسمیات کو بالائے طاق رکھ کر جو جی میں آئی کر گذرے۔

لیکن جیسے ہی یہ خبر بنی شاکر کو ملی تو یہ لوگ الاخوان جماعت پر ٹوٹ پڑے اور عمان سے بھی انگریزی فوج موٹر لاریوں میں بھر بھر کر آنے لگی۔ اسی اثنا میں طیارے بھی آ پہنچے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس میں کوئی ایک ہزار کے قریب الاخوانی لقمۂ اجل ہو گئے۔ اور پانچ سو جو بچ رہے تھے انہیں بنی شاکر نے بے آب و دانہ ہلاک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جوشیلے نادانوں میں سے صرف آٹھ آدمی بچ آئے۔

(۲)

الاخوان کی اس جاہلانہ حرکت سے ابن سعود سخت ناراض ہوا۔ وہ ہمیشہ انہیں سمجھاتا رہا کہ جوش کی حالت میں دور اندیشی کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا سراسر حماقت ہے۔ اب اہل قبائل نے پہلی دفعہ یہ تسلیم کیا کہ واقعی ابن سعود بہت ہی معاملہ فہم اور صاحب الرائے ہے۔ ابن سعود نے اُن آٹھ پسماندوں کو سخت سزا دی تاکہ دوسرے قبائل کو پھر کبھی ایسی جرأت کرنے کی ہمت نہ ہو۔

اس معاملہ کی یکسوئی کے لیے ابن سعود نے سرپرسی کاکس (Sir percy cox) کو عجیر پر ملنے کی دعوت دی۔ کاکس اور

ابن سعود میں قد و قامت اور کردار کے لحاظ سے ایک گونہ مشابہت تھی - ابن سعود سنتا بہت اور کہتا کم تھا۔ یہی کاکس کا بھی حال تھا۔ دونوں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں حد درجہ محتاط تھے۔

کاکس نے ابن سعود کے آگے سرحد کے تعین کا مسئلہ پیش کیا۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں سرحد کا کوئی تعین نہ تھا، ہر شخص کو اختیار تھا کہ جہاں چاہے اپنے جانور چرائے، اور جن چشموں کا چاہے پانی استعمال کرے۔ ایسے وسیع ریگستان میں سرحد کی حدود کا قائم کرنا بہت دقت طلب تھا لیکن کاکس نے اس پر بہت زور دے کر اسے قابلِ عمل بتلایا لیکن ابن سعود نے سمجھایا کہ ایسی حدود عرب کے ریگستان میں بے معنیٰ ہیں کیونکہ قبائل اس کی ذری بھی پرواہ نہ کرینگے۔ ابن سعود جانتا تھا کہ اس طرح کی حد بندی ہوجائے تو وہ ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہوگا۔ بہرحال کئی دن تک ابن سعود اور کاکس کے درمیان اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی اور آخر میں یہ طے پایا کہ حائل، شمر اور جوف پر ابن سعود کی حکومت رہیگی اور امن قائم رکھنے کے صلے میں انگریزوں کی طرف سے اسے کچھ سونا ماہوار دیا جائیگا۔ ساتھ ہی اس کے نجد اور عراق کے درمیان سرحد قائم کردی گئی اور دونوں سرحدوں کے درمیان کچھ حصّہ مشترکہ طور پر چھوڑ دیا گیا کہ جانبین اس سے استفادہ کرسکیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی تصفیہ ہوا کہ سرحد کے قریب یا چشموں کے

پاس کوئی قلعہ تعمیر نہیں کیا جائیگا۔

(۳)

تصفیہ تو ہو گیا لیکن ابن سعود کو اس سے کچھ تشفی نہیں ہوئی بلکہ وہاں سے وہ بہت کچھ افسردہ واپس آیا۔ اسے بے حد غصّہ آیا اور وہ چاہتا تھا کہ ایک دم انگریزوں پر ٹوٹ پڑے لیکن نتیجہ پر نظر ڈالتے ہوئے خاموش رہ گیا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے کہا "دیکھو، انگریز جو چاہتے ہیں انہیں مِل جاتا ہے اور ہم جب کچھ چاہتے ہیں تو اس کے لیے لڑائی کرنی پڑتی ہے"!

اِل قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ بالخصوص قبیلۂ مطیر کے لوگ بہت بے چین تھے۔ لطف یہ تھا کہ انگریز ادھر ابن سعود کو خاموش رہنے کے لیے کہتے اور جب اُدھر اس کے دشمن اس پر حملہ یا ظلم کرتے تو وہ انجان رہ جاتے تھے۔ چنانچہ بنی شمر کے جن لوگوں نے بغداد میں پناہ لی تھی، فیصل نے انہیں ہتیار دے کر نجد پر دھاوا بولنے کی اجازت دے دی۔ عبداللہ نے وادیٔ شیریں میں اپنی فوجیں روانہ کر کے چند گاؤں پر قبضہ کر لیا، حسین نے حرب اور عتبہ والوں کو دھمکیاں دیں۔

الاخوان حد درجہ جوشش میں تھے۔ صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً عراق میں جو شمری پناہ گزیں تھے ان پر حملہ کر کے بدلہ لے لیا اور شمال کی طرف وادیٔ شریک

بڑھ کر حسین اور شریف مکہ پر حملہ کا مطالبہ کرنے لگے۔ تمام قبائل اسی طرح غضبناک ہونے جا رہے تھے اور ابن سعود بھی اپنے آپ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی الجھن میں پڑ گیا۔

انگریزوں نے پھر سے ایک مرتبہ ابن سعود کو سمجھوتہ کے لیے دعوت دی۔ لیکن اس دفعہ کاکس کی عدم موجودگی کے باعث، دوسرے انگریز نمائندے ابن سعود سے کچھ طے نہ کر سکے اس لیے کہ وہ ابن سعود کی حقیقی حیثیت اور اس کے اثر سے ناواقف تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ محض ریاض کا امیر ہے حالانکہ وہ نجد کا سلطان اور وسط عرب کا والی تھا۔ انگریزی نمایندوں کا برتاؤ ابن سعود کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں رہا جس سے ابن سعود ایک سچے عرب کی طرح بھڑک اٹھا۔ اب اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

"ہاں" اس نے کہا "یہ سچ ہے کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں لیکن ان کا ساتھ صرف اس حد تک دے سکتا ہوں جس حد تک کہ مجھے میرا مذہب اور میرا مرتبہ اجازت دے سکتا ہے۔"

پھر بھی ابن سعود نے خود ضبطی سے کام لیا اور صرف موقع کا منتظر تھا۔ ناممکن کے آگے سر مارنا اس کی زندگی کا اصول نہ تھا۔

(۴)

ابھی کانفرنس ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ خبر آئی کہ حسین نے خرما اور ترابہ پر حملہ کر کے ان دونوں شہروں پر قبضہ جما لیا ہے،

اور عبداللہ اور فیصل اپنی اپنی فوجیں لے کر اس کی امداد کو آچکے ہیں۔ اور اب نجد پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر ابن سعود آپے سے باہر ہوگیا اور سارا نجد غصہ سے آگ ہوگیا۔ چاہے کچھ ہی ہو، عقلمندی یا بیوقوفی، اب کی دفعہ تو وہ حسین پر حملہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اسے بدقسمتی کہیے کہ ان دنوں ابن سعود کے چہرے پر سُرخ بادہ کی علامات ظاہر ہونے لگیں اور وہ اسی سلسلے میں اتنا سخت علیل ہوا کہ صرف ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ اپنے بستر سے حرکت کرنا تک اسے بار تھا۔ آخر کار اس کا بخار کم ہوا اور سُرخ بادہ کے زہریلے اثرات کم ہوگئے لیکن ساتھ ہی اس کے اس کی بائیں آنکھ درد دینے لگی۔ اور چند دنوں میں بصارت جاتی رہی۔ مقامی ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن بے سود۔ پھر شامی ڈاکٹر کو بلایا، اس کے علاج سے کچھ افاقہ تو ہوا لیکن بصارت نہ آئی۔ آخر میں ایک مصری ڈاکٹر سے آپریشن کرایا گیا جس سے بصارت عود کر آئی۔

بیماری کے زمانے میں ابن سعود اپنے دشمنوں کی حرکات و سکنات سے بے خبر نہیں رہا اور حتی الوسع کچھ نہ کچھ کام بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن ابن سعود کی قسمت زوردار تھی۔ جب کبھی حالات اس کے مخالف ہوئے قدرتی طور پر اس کی امداد کے وسائل بہم پہنچ گئے۔ چنانچہ خرما اور ترابہ کے باشندوں نے حسین کی شدید مخالفت کی اور اس کی فوج پر حملہ کر کے اسے مار بھگایا۔ عام طور سے

لوگ حسین، شریف مکہ کے برتاؤ سے نالاں تھے، انہیں شکایت تھی کہ حسین خود مختار حکمراں ہے۔ سب کام اپنے ماتحتین سے کراتا اور اپنی جیب بھرتا ہے۔ عہدہ داروں کی تنخواہیں اس لیے گھٹا دی گئی ہیں کہ وہ رشوت سے اس کی تکمیل کرلیں۔ نیز وہ اس بات کے بھی شاکی تھے کہ حسین ملکی فلاح وبہبود کے معاملہ میں کسی نیک اور مفید مشورہ کو سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی اس قسم کی جرارت کرتا تو اسے قید خانہ کی ہوا کھلادی جاتی۔ اس سے حجاز کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ آمدنی کا کثیر حصہ شریف کی جیب خاص میں جاتا۔ قربانی کے بکروں کا ٹھیکہ اسی نے لے رکھا تھا۔ بدویوں سے سستے دام بکرے خرید لیے جاتے اور حاجیوں کو خاصے دام لے کر فروخت کیے جاتے۔ حاجیوں سے باوجود اس کے کہ کثیر رقم لی جاتی تھی لیکن ان کی آسائش اور جان کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں لی جاتی تھی۔ بالخصوص جاوا کے غریب حاجی ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں بھوک پیاس کا شکار ہوتے تھے۔

اس بدانتظامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجیوں کی تعداد میں کمی ہوگئی اور اہل حجاز کو جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی تھی، وہ بہت کچھ گھٹ گئی۔ نہ صرف یہی بلکہ اہل حجاز پر بہت سے نئے نئے ٹیکس لگائے گئے انگریزوں کی امداد کے بند ہوجانے کی وجہ سے حسین نے اپنی آمدنی کے برقرار رکھنے کے لیے اہل ملک اور حجاج سے اس کی تلافی

کرانی چاہتا تھا۔

تمام حجاز حسین سے نالاں تھا، خود اس کے ملازم اور سپاہی اس سے بدظن ہو گئے تھے۔ وہ ترکوں کا زمانہ یاد کرنے لگے جب کہ حاجی کثیر تعداد میں آتے اور دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اہل مکہ و مدینہ پر نام کو ٹیکس نہ تھا بلکہ لٹے حاجیوں سے انہیں بہت کچھ مل جاتا تھا لیکن حسین کا برتاؤ ان کے حق میں مضر ثابت ہوا اور وہ اس کی حکومت سے بیزار آ گئے۔

یہ تو گھر کی حالت تھی۔ بیرونی ممالک بھی حسین سے اسی طرح بدظن ہو گئے تھے۔ حسین کے برتاؤ سے مصر، ترک، ہندوستان غرض ہر جگہ کے مسلمان تنگ آ گئے تھے، حسین کو ان سب باتوں کی اطلاع تھی لیکن اس کے باوجود بلادِ عرب کی شہنشاہیت کا جنون اور بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو خدا فرستادہ جتلا کر اس کے ثبوت میں کلام پاک کی آیتیں تلاوت کرنے لگا جس پر اسلامی دنیا نے خوب مضحکہ اُڑایا۔

اسی جوشِ جنوں میں حسین نے انگریزوں سے بھی مخالفت پیدا کر لی اور ان سے ان تمام معاہدات کی تکمیل کا مطالبہ کیا جو جنگ عظیم کے زمانہ میں ہوئے تھے۔ وہ خود کو ملک عرب کا شہنشاہ تسلیم کروانا اور شام سے فرانسیسیوں اور فلسطین سے غیر ملکی یہودیوں کو نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے شام اور فلسطین کے

عربوں کو بھڑکایا اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف انہیں امداد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

انگریزوں نے معاملہ کا سمجھوتہ کرنے کے لیے کرنل لارنس کو حسین کے پاس روانہ کیا کہ وہ حسین کو یہ بات سمجھائے کہ اگر وہ صلح نامہ ورسلینز پر دستخط کر دے تو انگریز ہر بیرونی حملہ کے خلاف اس کو مدد دینگے اور خواہ وہ حملہ ابن سعود ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ لارنس نے حسین کو اپنے خیالات کا ہم نوا بنانے کی ممکنہ کوشش کی لیکن حسین نے ایک نہ مانی بلکہ یہ کہہ دیا کہ

"بہ جائے اس کے کہ میرے کندھے انگریزوں کے غیر ملکی جوئے سے دبے رہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سرزمین عرب پر مطعون ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر لوں"۔

۱۹۲۳ء میں انگریزوں نے پھر سے ایک مرتبہ مصالحت کی کوشش کی مگر حسین اپنی بات پر جما رہا۔ ضعیف العمری کے باعث استدلال اور فیصلہ کی قوتیں اس سے مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔

اس زمانہ میں انگریزوں کو بھی چین نصیب نہ تھا۔ اگرچہ انگریز جنگ عظیم میں کامران رہے تاہم جنگی اخراجات اس قدر عائد ہو چکے تھے کہ مالیہ کو سنبھالنا ایک اہم ترین کام ہو گیا تھا۔ جب خود ملکی اخراجات کا سوال معرض بحث میں آ جائے تو ایسی صورت میں دیگر ممالک پر اپنا روپیہ خرچ کرنا ان کے لیے محال اور ناممکن تھا۔

مالی مشکلات کے علاوہ بہت کچھ سیاسی پیچیدگیاں بھی پڑی ہوئی تھیں جو ہر بڑی جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ فرانسیسی حکومت سے تعلقات صاف نہیں تھے ۔ آئرلینڈ میں مخالفتیں پھیل رہی تھیں، ہندوستان میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، افغانی بھی کچھ جنگ کے لیے تلے ہوئے نظر آ رہے تھے ۔ مصر اور عراق میں بھی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ترک موصل پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے ۔ ان حالات کی تحت انگریز حسین کے ساتھ جھگڑ کے اپنا روپیہ خرچ کرنا اور جنگ عظیم کے تھکے ماندے سپاہیوں کا روانہ کرنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے ۔ انہوں نے فی الحال اس مسئلہ کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا ہی مناسب تصور کیا ۔

اس زمانہ میں ابن سعود نے حسین پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کردی ۔ حسین کے بیٹوں، فیصل اور عبداللہ نے باپ کو بہتیرا سمجھایا کہ وقت نازک ہے، انگریزوں سے مل کر کام کرنا ہی مناسب ہوگا ۔ لیکن یہ بات حسین کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ اپنی بات پر اڑا رہا ۔ فیصل اور عبداللہ نے انگریزوں سے درخواست کی کے وہ ابن سعود کو حملہ سے روکیں ۔ لیکن اب انگریز اس جنجال میں پڑنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے صاف کہدیا ۔

"حسین اور ابن سعود دونوں ہمارے حلیف اور خود مختار حکمراں ہیں ۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے راضی نہیں تو خود انہیں

اپنے اختلافات دور کر لینے چاہئیں۔ ہم مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔"

اس اثناء میں ابن سعود کو پوری صحت ہوگئی اور اس نے حسین پر حملہ کرنے کی باقاعدہ تیاری شروع کردی۔ حرب، عتیبہ اور حجاز میں اپنے ملاؤں کو روانہ کیا کہ وہ وہاں کے باشندوں کو حسین کے خلاف اکسائیں اس سلسلہ میں انہیں کچھ زیادہ دقت اٹھانی نہیں پڑی کیونکہ ماحول پہلے ہی سے حسین کے خلاف ہوچکا تھا۔ ابن سعود نے اپنی مقبولیت کے لیے بیرونی ممالک سے بھی تعلقات اچھے رکھے۔ فرانسیسی اس کے مخالف نہ تھے، مصر اور ہندوستان کے مسلمان بھی اسے پسند کرنے لگے تھے، انگریزوں کو بھی اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پہ لانے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ عراق اور شرقِ اردن میں اگر سعودی کچھ گڑبڑ مچاتے تو ابن سعود ان کو سزا دیتا اور ایسی بدعنوانیوں کو روکتا رہتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حسین اپنے لڑکے عبداللہ کے پاس شرق اردن گیا اور اس شہر پر اپنا قبضہ کر کے اسے وائسرائے بنا دیا۔ کیونکہ وہ اب انگریزوں کا تسلط نہیں چاہتا تھا۔ اسی زمانہ میں ۴ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کو ترکی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ ساتھ ہی حسین نے خود کے خلیفۃُ المسلمین ہونے کا اعلان کردیا۔ یہ خبر ہوا کی طرح عام ہوگئی۔ اور تمام اسلامی دنیا میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ ابن سعود کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ہمیشہ موقع کا منتظر رہا۔

(۵)

ابن سعود بہت ہی بلند اور وسیع خیال کا انسان تھا۔ مفلسی اور بے یار و مددگاری کے زمانہ میں بھی وہ کویت کی گلیوں میں دوست احباب کے ساتھ اپنے شاندار مستقبل کے متعلق ڈینگیں مارا کرتا تھا، لوگ اس پر ہنستے اور قہقہہ لگاتے اور اسے خوب بناتے تھے لیکن اس سے اس کے مستقل ارادے متزلزل ہونے نہ پائے۔ اسے خود اپنے اور اپنے لوگوں پر کافی سے زیادہ اعتماد تھا اور اسے یقین تھا کہ عربوں میں تنظیم کی صلاحیت ہے بشرطیکہ ان کی مناسب رہبری کی جائے۔ اسے سارے عرب پر حکومت کرنے کی دُھن تھی اور اسی دُھن میں وہ توپوں کے منہ پر ہزار ہا سپاہیوں کا مقابلہ کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ خدا کا خوف ہمیشہ اس کے دل پر رہا۔ وہ مسلمانوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ "الاخوان" اس کے خیالات کا ایک عملی نمونہ تھا۔

ابن سعود کے دشمن اس کے مقاصد سے متعلق شکوک رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ مذہب کی آڑ میں دنیا داری کر رہا ہے اور مذہب کو اپنا حربہ آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ریاض کے بعض علماء بھی ابھی تک اس کے متعلق شک کرتے تھے تاہم کسی کو اس کے خلاف منہ ہلانے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ مذہبی احکامات کی پابندی میں وہ علماء سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پانچ وقت کی نماز

مسجد میں ادا کرنا، شراب و زنا کو سے اجتناب کرنا، روزے رکھنا، خیرات دینا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا ـــــ یہ سب اس کے اہم اور ضروری مشغلے تھے۔

بچپن ہی سے ابن سعود باپ کی نگرانی اور تعلیم کے باعث مذہبی آدمی بن گیا تھا۔ عام جلسوں میں، تنہائی میں، میدان جنگ میں، کھلے ریگستان میں، خیمہ میں ـــــ ہر جگہ۔ اسے خدا کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ اسی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ ہر مسئلہ پر نہایت خشوع و خضوع سے غور کرتا اور بھلائی کے لیے خداوند کریم سے دعا مانگتا تھا۔ مذہب اور سیاست اس کے پاس دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں بلکہ ایک اور بالکل ایک۔ وہ کہا کرتا تھا۔

"میں اول تو مسلمان ہوں اور پھر عرب کا رہنے والا۔ خداوند کریم کا ایک ادنیٰ بندہ"

ابن سعود کے دشمن اس کے متعلق بہت کچھ کہا کرتے تھے لیکن اس کے خلوص کے متعلق کسی کو زبان ہلانے کی گنجائش نہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے اسے اپنے لوگوں پر کامل بھروسہ تھا اور اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اگر اہل عرب کی تنظیم کی جائے تو وہ بہتر سے بہتر کام کر سکتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ اس نے فلبی سے حسین کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے کہا

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں صرف زبان ہلا دوں تو

ہر حصہ سے لوگ جوق در جوق آ کر میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہونگے۔ ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے کہ زندگی سے موت بہتر ہے اور ہر ایک اس گرانقدر انعام کے لیے زندہ ہے۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اس معاملہ میں پیچھے ہٹنا یا پس و پیش کرنا جہنم کی آگ کے لیے تیار رہنا ہے۔"

اس کے اور الاخوان کے اعتقاد[1] میں کوئی فرق نہ تھا البتہ وہ

---

[1] الاخوان کے متعلق اس سے پیشتر کے کسی باب میں تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔" یہ غازیوں اور مجاہدوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ توحید پر مرجانے والوں اور جان دینے والوں کی جماعت ہے جو حمیت و عصبیت دینی میں نہایت شدید ہے" ان کا نعرۂ مجاہدانہ یہ ہے

عُودوا الی اللهِ ایُّها المشرکون ۔عُودوا الی النبی و السنة عُودوا الیٰ دین التوحید لحن الاخوان علیکم .... ان سیفنا بتار و لوعنا عصیب ۔ (پلٹو اللہ کی طرف اے مشرکو! پلٹو نبی اور سنت کی طرف ۔ پلٹو دین توحید کی طرف ۔ ہم تم پر مسلط ہیں .... ہماری تلوار تیز اور ہماری لڑائی کٹھن ہے۔)

اس جماعت کا نعرۂ جنگ یہ ہے ۔ هبت هبوب الجنه این انت یا باغیها (جنت کی ہوائیں آرہی ہیں، اے کہ تو اس کا آرزومند ہے کدھر ہے) تاریخ نجد از اسلم جیراجپوری۔ ص ۲۱،۲۲

یہ جماعت بلاشبہ ایک زبردست طاقت کی مالک ہے۔ البتہ اس کی ابتداء میں تنظیم کم تھی جس کے باعث انہوں نے بعض ایسی غلطیاں کیں جن کو اسلامی دنیا نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا لیکن اب ابن سعود نے اس کو بہت کچھ منظم کرلیا ہے اور آئے دن اس خدا پر جان دینے والی جماعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مذہب کے اندھے تھے اور غلطیوں کے مرتکب ہوتے تھے اور یہ ہوشیاری سے کام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ دویش نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی صلاح دی۔ ابن سعود نے سرکارؐ کا یہ حکم سنا کر صاف انکار کر دیا کہ اگر فتح کا پورا یقین نہ ہو تو جہاد نہ کرو۔ اسی طرح ریاض کے علماء بھی اسے طرح طرح کے مشورے دیتے اور غیر ممالک کے باشندوں سے تعلقات منقطع کرنے کے لیے اسے مجبور کرتے تھے، لیکن ابن سعود جہاں تک مذہب کا تعلق تھا ان کی سنتا تھا اور جب کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا تو اس سے صرف اس وقت متفق ہوتا تھا جب کہ اس میں کوئی جان ہو۔ ابن سعود کی یہ فطرت ثانی ہوگئی تھی کہ وہ ہر بات کو پہلے عقل کی ترازو میں تولتا تھا اور پھر اس پر عمل کرتا تھا۔ چنانچہ کئی لوگوں نے اسے خلافت کے لیے کہا، اکثروں نے اسے امام مہدی کے فرائض انجام دینے کو کہا۔ مگر ابن سعود ایسا اوچھا نہ تھا جو ایسی فضول باتوں پر کان دھرتا۔ وہ سب کی سنتا اور خاموش اپنا کام کرتا تھا البتہ حسین کو شکست دے کر مکہ کی مقدس سرزمین کو برائیوں سے پاک کرنے کے متعلق وہ اپنے لوگوں کا ہم نوا اور بذات خود اس کے لیے سخت کوشاں تھا۔

ان سب باتوں کے علاوہ ابن سعود شریعت کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا کسی قیمت پر گوارا نہ کرتا تھا۔

―――― ۶ ――――

ابن سعود نے حسین پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن اس

سلسلہ میں ابھی کوئی عملی قدم آگے نہیں بڑھایا کیونکہ حجاز کو حاصل کرنا، احساء، حائل اور شمر پر حملہ کرنے کی طرح آسان تو نہ تھا۔ کیونکہ کئی اعتبار سے اس خطۂ پاک کو بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی، یہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ قابلِ احترام سرزمین اور اللہ کا گھر تھا، ہر مسلمان اس سے خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ اگر دنیا کے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ابن سعود حجاز کو اپنی قوت بازو سے فتح کرلیتا تو تمام عالم اسلامی کے نزدیک یہ فعل ہرگز ہرگز مستحسن اور قابل قبول نہ ہوتا۔ اسی لیے سب سے پہلے ابن سعود نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کردیا کہ جب تک سارا عالم اسلامی حسین کو اپنا خلیفہ تسلیم نہ کرلے، وہ کبھی اس کی خلافت کو تسلیم نہیں کریگا۔

عرب کی حد تک حسین کے متعلق غور و خوض کرنے کے لیے ابن سعود نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں عرب کے تمام قبائل کے علماء، شیوخ اور سردار جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ ابن سعود بھی کسی خاص اعزاز یا شان و شوکت کے بغیر اس جلسہ میں شریک تھا۔ کارروائی شروع ہوئی اور ایک ایک کرکے تمام علماء اور شیوخ نے حسین پر حملہ کرنے کی صلاح دی اور استدلال میں یہ بات پیش کی کہ گذشتہ دو سال سے کسی وہابی کو حج کا موقع نہیں ملا تھا۔ الاخوان تو بس جنگ کے لیے مر رہے تھے۔

ابن سعود اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا ہوا سب سن رہا تھا لیکن جب

حسین پر فوری حملہ کرنے کا تصفیہ ہونے لگا تو پھر اس نے مخالفت شروع کی اور کہا کہ جب تک سارا عالم اسلامی خلافت کے بارے میں اپنی رائے نہ دے لے، حسین پر حملہ کرنا بے فائدہ ہوگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے لڑکے فیصل کی دستخط سے، تمام بلاد اسلامیہ میں، حسین کے واقعات —— اس کی سختیاں، اس کی ناانصافیاں، اس کے مظالم، اور اس کی خود غرضیوں وغیرہ کو لکھ بھیجا اور مشورہ طلب کیا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے عقائد کی موافقت یا مخالفت کے اعتبار سے مختلف النوع جواب آئے۔ بعضوں نے حسین کی موافقت کی، اکثروں نے اس کی مطلق العنانی اور ظلم و ستم کے لحاظ سے اس کی مخالفت کی، بہرحال اکثریت حسین کے خلاف تھی اور ابن سعود سے اس امر کی متمنی تھی کہ وہ حجاز کو حسین کے جوئے سے نکال کر آزاد کر دے تاکہ حجاج کو چین و اطمینان نصیب ہو۔ رہا خلافت کا سوال، تو اس کے متعلق دنیا کے تمام مسلمانوں نے حسین کی مخالفت کی اور وہ اب بھی سلطان عبدالحمید خاں ہی کے موافق تھے اور جائز حق دار سمجھتے تھے۔

﴿ ۷ ﴾

اب تمام حالات ابن سعود کے موافق تھے، حسین تن تنہا تھا، انگریز بھی اس سے بیزار آگئے تھے، وہ اپنے لڑکوں کی بھی بہت کم سنتا تھا جس سے وہ بھی بدظن ہوگئے تھے۔ ان حالات کی تحت

ابن سعود کے مشیروں نے شدت کے ساتھ حملہ کرنے پر زور دیا۔ کامیابی ناگزیر تھی۔

ابن سعود حملہ کے متعلق اپنے خاص منصوبے رکھتا تھا۔ وہ پہلے خرما اور ترابہ کی طرف سے سیدھے مکہ اور جدّہ اور پھر وسط حجاز پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ عبداللہ اور فیصل کو روکنے کے لیے اس نے ایک فوجی دستہ عراق کی سرحد پر روانہ کیا اور ایک دوسرا فوجی دستہ جوف سے وادئ شیریں کی طرف اور ایک دوسرا دستہ مدینہ اور دمشق کے درمیان ریلوے پٹڑی کی جانب۔ سلطان ابن بجاد شیخ عتیبہ کو حجاز کی سرحد پر بھیجا کہ وہاں وہ ہنگامہ مچائے اور لوئی کو خرما سے سیدھے مکہ کی طرف حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

خرما سے پرے شہر طائف واقع تھا، یہ بڑا ہی خوش نما اور خوش منظر شہر تھا، یہاں ایک قلعہ اور کچھ فوج تھی۔ اس کی فصیل بڑی مضبوط تھی۔ یہ شہر حسین کا تفریح گاہ تھا اور جب مکہ میں زیادہ گرمی ہوتی تو حسین یہاں آکر قیام کرتا تھا۔

لوری کو اطلاع ملی کہ آج کل حسین کا بیٹا علی جو اس کی فوج کا کمانڈر تھا، تفریح کی غرض سے طائف آیا ہوا ہے۔ لوری نے بجاد کو اس کی اطلاع کردی اور بجاد نے فوراً جتنی بھی فوج مل سکی، جمع کر کے طائف پر حملہ کردیا۔ علی کوئی ایسا اچھا سپاہی نہ تھا، شہر کے دروازے کھلے چھوڑ کر وہ بھاگ نکلا۔ چوطرف سے الاخوان ٹوٹ پڑنے لگے۔

اس اثناء میں علی نے ہدا پر اپنی فوج جمع کرلی اور مقابلہ کے لیے تیار ہوگیا لیکن الاخوان اس زور سے دھاوا بول رہے تھے کہ علی کی فوج کے پیر میدان سے اُکھڑ گئے اس طرح علی کی فوج کو درہم برہم کرکے الاخوان نے سیدھے مکّہ کا رُخ کیا۔

یہ خبر جو مکہ کو پہنچی تو ایک دھوم سی مچ گئی۔ لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اکثروں نے اپنا گھر بار چھوڑ اور کچھ ضروری سامان لے، جدہ کا رُخ کیا۔ بے شمار لوگ ہراسان اور بدحواس تھے۔ ان کے دلوں پر الاخوان کی دھاک بیٹھی ہوی تھی۔

حسین بھی بزدل نہ تھا بلکہ وہ سعودیوں کے خلاف مرتے دم تک لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے لڑکے علی کو جدّہ روانہ کردیا اور اپنے لوگوں کے پاس پیغام بروں کو دوڑایا کہ وہ حملہ کی مدافعت کریں کسی نے امداد نہ دی۔ خود اس کے ملازم اور سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا البتہ اس کے چند رشتہ داروں اور غلاموں نے ساتھ دیا۔

ابھی وقت تھا۔ جدّہ اور مکہ کے درمیان رستہ کھُلا تھا۔ حسین کے مشیروں نے صلاح دی کہ وہ اپنے لڑکے کے حق میں تخت سے دست بردار ہوجائے تاکہ مکہ لوٹ مار سے بچ سکے۔ جدہ کا ناظم کرورڈ گیری طویل حسین کا بے حد دوست تھا۔ حسین اس کی بہت سنتا تھا۔ طویل نے حسین کو دست برداری کی صلاح دی۔

لیکن حسین کے دماغ میں بادشاہت کا جنون زور پکڑ رہا تھا۔ دوست احباب اور مخلصوں کے مشوروں سے غصہ کے مارے وہ جھنجلا گیا اور سب کو تلخ جواب دیا۔ رشتہ داروں نے اس سے التجا کی کہ خدارا ایسے نازک موقع پر سنجیدگی سے کام لیجئے۔ اہلِ شہر نے رُو رُو کر استدعا کی لیکن اب بھی حسین اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہ حال دیکھ کر شہری اس کے محل کے اطراف جمع ہو گئے اور یہ طے کرلیا کہ حسین کو پکڑ کر دشمنوں کے حوالہ کردیا جائے اور اس کی جمع کردہ دولت لوٹ کر حصے بخرے کر لیے جائیں۔

اب تو حسین کو تخت چھوڑتے ہی بنی۔ حسین نے بادلِ ناخواستہ مجبور ہوکر دست برداری کا اعلان کردیا۔ اس کے پاس بارہ موٹریں تھیں۔ ان میں اپنا تمام قیمتی اثاثہ بھر کر سیدھے جدّہ چلا گیا پھر یہاں سے ایک جہاز کے ذریعے عقبہ ہوتے ہوئے جزیرۂ سائپرس پہنچا۔

(۸)

الاخوان کی اس مہتم بالشان کامیابی پر سب سے زیادہ حیرت ابنِ سعود کو ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ آخری لمحہ میں بھی انگریز حسین کو مدد دینگے۔ اسے ہرگز ہرگز امید نہ تھی کہ وہ دشمن سے اتنا جلد پسپا ہوگا۔

علی نے مکہ آکر ابن سعود کی مدافعت کے لیے بہت کچھ انتظام کیا لیکن اس سے کچھ خاطر خواہ تشفی نہ ہوئی کیونکہ مکّہ اور اطرافِ مکہ

کے لوگ بہت بد دل ہو گئے تھے اور الاخوان کے نام سے کانپتے تھے۔
علی بھی ابن سعود سے مصالحت کرنے کا خواہاں تھا کیونکہ وہ جنگجو نہیں بلکہ عافیت پسند تھا لیکن طویل کے اکسانے پر وہ مدافعت کے لیے راضی ہو گیا۔ علی نے اس کے بعد انگریزوں سے امداد طلب کی لیکن انگریزوں نے مذہبی جنگ قرار دے کر امداد سے صاف انکار کر دیا۔

انگریزوں کا یہ جواب سن کر علی نے ابن سعود سے صلح کی درخواست کی لیکن ابن سعود اس پر راضی نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حجاز کی سرزمین میں حسین کے خاندان کا ایک بچہ بھی بچ رہیگا تو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس نے بجاد اور لوی کے ساتھ اپنے چند سپاہی روانہ کیے اور ہدایت کی کہ طائف کی طرح لوٹ مار نہ کی جائے اور اگر کوئی بدعنوانی ہوگی تو اس کے ذمہ دار بجاد اور لوی ہونگے۔
بجاد نے مکہ کے باہر ڈیرا ڈال دیا اور اپنے چار سپاہیوں کو زائرین کے لباس میں غیر مسلح شہر کے اندر بھیجا۔ مکہ میں کامل سکوت تھا' بازار اور مکان بند پڑے تھے۔ ان چاروں سواروں نے بآواز بلند شہر کی گلی کوچوں میں پھر پھر کر اعلان کر دیا کہ

خدا کے فضل سے سب کو جان کی امان ہے
ابن سعود تمہارا حکمران ہے

دوسرے دن لوی نے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ مکہ پر قبضہ

کرلیا۔ لوٹ ہی کٹا وہابی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل مکہ کے ساتھ بھی وہی کیا جائے جو طائف والوں کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن ابن سعود کی ناراضگی سے ڈر کر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس پر الاخوان جماعت کے لوگوں نے مساجد اور مقابر پر جو زیبائشی اشیاء تھیں ان کو فوراً نکال دیا۔ لوئی نے انہیں اس سے زیادہ اجازت نہ دی۔

اس کے بعد مکہ کی اطراف کے قبائل نے ابن سعود کی بلاچوں و چرا اطاعت قبول کرلی۔ البتہ دو ایک قبیلوں نے کچھ مخالفت کی لیکن الاخوان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے آخر انہیں بھی سر جھکانا ہی پڑا۔

بندرگاہ جدہ اور ینبوع اور شہر مدینہ —— یہ تینوں اچھی طرح محصور تھے۔ یہاں کے باشندوں نے اطاعت سے انحراف کیا۔ ان کے علاوہ تمام حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہوگیا۔

اس فتح کے بعد ابن سعود ریاض پہنچا، ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور اپنی فتوحات کی اطلاع تمام بیرونی ممالک کو کرائی اور یہ لکھ بھیجا کہ

"اب ناانصافی اور غاصبیت کا دورہ ختم ہوچکا ہے، ہماری حقیقی آرزو یہ ہے کہ اسلام کی مقدس سرزمین تمام مسلمانوں کے لیے کھلی رہے۔ اور مقامات مقدسہ کی کارروائیوں کا تصفیہ خود سب مسلمان بیٹھ کر کرلیں۔

ہم خود مکّہ جائینگے اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ہمارے تمام مسلمان بھائی بحث و مباحثہ اور تصفیہ کے لیے اپنے اپنے نمائندے روانہ کریں۔"

اس کے بعد ابن سعود اپنے بیٹے سعود کو ریاض میں اپنا قائم مقام بناکر خود علماء، شرفاء، وزراء اور سردارانِ عساکر وغیرہ کو لے کر مکّہ کا رُخ کیا۔ یہ سفر بہت آہستگی سے طے ہوا اس لیے کہ راستہ میں اہلِ قبائل آآکر اس سے ملتے، اس کی کامیابی پر مبارکباد دیتے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ چودھویں دن ابن سعود نے اپنے مشیرِ خاص حافظ وہبہ اور وزیر خارجیہ دولوجی کو استقبال کے لیے آگے روانہ کر دیا۔

پندرہویں دن وہ مکّہ معظمہ پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے احرام باندھ لیا۔ کھڑاویں پہن لیے، اور برہنہ سر، غیر مسلح عرفات کی پہاڑی اور پھر وادیٔ ابطح اور معابدہ کی ریتلی سڑک سے ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچا۔ اس کی زبان پر یہ کلماتِ طلبیہ جاری تھے۔

لبيك اللّٰهم لبيك لاشريك لبيك اِنّ الحمد والنعمة والملك لاشريك لك

قبرستانِ معلیٰ کے پاس لوءی اس سے آملا۔ لوءی کے ساتھ وہ شہر میں داخل ہوا۔ اہلِ شہر نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دئے اور باہر آآکر ابنِ سعود کو دیکھنے لگے۔ ابن سعود سیدھے جامع مسجد پہنچا اور وہاں جاکر ارکان حج ادا کیے

تیرھواں باب

حجاز کی فتح

۱

مکہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ابن سعود نے حجاز کی مقدس سرزمین اور سارے عرب کی تنظیم جدیدہ کا بیڑہ اٹھایا۔ حجاز کے علاوہ دوسرے علاقوں میں وہ اپنی مرضی کے موافق نظم ونسق قائم کرسکتا تھا لیکن حجاز کا معاملہ ساری دنیا کے مسلمانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر اس کے نظم ونسق میں ذری بھی فروگذاشت ہو جاتی تو دنیائے اسلام میں ایک تہلکہ مچ جاتا اور اس کی شہرت اور نیک نامی پر پانی پھر جاتا۔ اسی لیے حجاز کی حد تک ابن سعود اپنی طبیعت کے خلاف پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ مبادا کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔

اس سلسلہ میں ابن سعود کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی دعوت پر مختلف ممالک سے مسلمان نمائندے آئے اور

غصہ میں بھرے ہوئے آئے ۔ وہ پہلے ہی سے وہابیوں کے عقائد کے خلاف تھے، شریف مکہ کے پروپاگنڈے نے آگ پر پانی کا کام کیا اور دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ابن سعود کے خلاف ہوگیا ۔ چنانچہ ایران اور عراق کے اہل تشیع نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ مکہ پر وہابیوں کا قبضہ ہوگیا، حج وزیارت میں تکلیف ہوگی، یہ لوگ بڑے جاہل اور سخت ہیں، طائف میں انہوں نے وہ دھوم مچائی، توریت کو ویسا تباہ کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ کے گنبد ڈھا دئے۔ ابن سعود نے ان سب باتوں کو سُنا اور ان لوگوں کے اعتراضات پر بھڑک اُٹھنے کی بجائے اس نے سنجیدگی سے کام لیا اور معترضین کو حجاز آکر صفائی کرنے کی دعوت دی ۔ چنانچہ ایران سے کئی لوگ آئے۔ پہلے ان کا طور بہت مخالفانہ رہا لیکن ابن سعود نے جب واقعات کی تفہیم کی تو وہ مطمئن ہوکر اپنے وطن واپس چلے گئے ۔

مصر سے بھی کئی نمائندے اسی غرض سے مکہ آئے۔ مصری بڑے نقاد اور لڑاکو واقع ہوئے ہیں ۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ حسین کی زبانی معلوم ہوا کہ الاخوان مدینہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور نعوذ باللہ گنبد خضرا پر ہاتھ ڈالنے والے ہیں ۔ اور دوش مدینہ کو لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہے ۔ ابن سعود نے بتایا کہ واقعات سب غلط بیان کیے گئے ہیں ۔ یہ سب شریف حسین کی ریشہ دوانی ہے ۔ حالانکہ واقعات بالکل مختلف ہیں ۔ مصریوں کو اطمینان ہوگیا اور

وہ خوشی خوشی اپنے وطن سدھارے۔

اس کے بعد ہندوستانی علماء کا گروہ پہنچا۔ ہندوستانی علماء نہ صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی خیالات سے بھی متصف تھے۔ ان کے اور ابن سعود کے مابین زوردار مباحثہ ہوا لیکن دونوں کسی سنجیدہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے لیکن ساتھ ہی اس کے دونوں ناراض بھی نہیں ہوئے۔

ترکی سے شیخ سنوسی آئے۔ یہ بہت بوڑھے اور سخت مذہبی آدمی تھے۔ لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور دنیا میں ان کے معتقدین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے وہابیوں پر اعتراضات کی بوچھار کردی اور خوب ہجو کی۔ وہابی اس پر حد درجہ مشتعل ہوگئے قریب تھا کہ کوئی جھگڑا ہوجاتا لیکن ابن سعود نے نہایت ہوشیاری سے اس معاملہ کو رفع دفع کردیا۔

اس طرح ابن سعود پر چوطرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی لیکن وہ خاموشی سے اپنے منصوبے گھڑنے لگا مخالفین نے یہ سمجھا کہ شاید ابن سعود اپنے کیے پر پشیمان ہے۔

ابن سعود نے پھر حجاز میں ایک عارضی حکومت قائم کردی اور اس پر ایک کمیشن مقرر کرکے اس کا صدر اپنے دوسرے لڑکے فیصل کو بنایا۔ لوءی کے ذمہ فوج کردی اور حافظ وہبہ کو سیول گورنر مقرر کیا، اس کے بعد جدہ، ینبوع اور مدینہ کی

طرف رجوع ہوا۔

(۲)

حسین اور ابن سعود کی باہمی نزاع سے متعلق انگریزوں کا خیال تھا کہ اس جھگڑے میں دونوں کی قوت کمزور ہو جائیگی لیکن حسین کی حیرتناک اور غیر متوقع ناکامی نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس موقع پر انگریزوں نے کسی نہ کسی طرح کا معاہدہ کرلینا ہی مناسب سمجھا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سر گلبرٹ کلے ٹن کی زیر صدارت ابن سعود کے پاس ایک وفد روانہ کیا۔ اس سے قبل انگریزوں نے شہر عقبہ کے اطراف کچھ حصّہ پر قبضہ کرلیا جو حجاز کے شمال میں واقع ہونے کے علاوہ سوئز اور مصر کا رستہ بھی ہے۔ ابن سعود نے اس وفد سے مکہ اور جدہ کے درمیان مقام بحرہ پر اپنے جنگی خیمہ میں ملاقات کی۔ ابن سعود نے نہایت اطمینان کے ساتھ اس وفد سے بحث کی، وہ سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھا، چپکے سے وادئ شیریں کے شمال میں اپنی فوجیں بھیجدیں اور وہاں ایک مخصوص حصّہ پر قبضہ کرلیا۔ اس حصّہ پر قبضہ ہوجانے سے انگریزوں کے منصوبے برابر ہوگئے۔ وہ اسی چیز کو نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس سے ابن سعود کو بحر متوسطہ کی طرف رستہ مل گیا اور فلسطین کو بھی ایک طرح کی دھمکی ہوگئی۔ انگریز بغداد اور پھر ہندوستان تک

ہوائی رستہ بنانا چاہتے تھے۔ اور موصل سے حیفہ تک انگریزی فوج کے لیے تیل کی نہر نکال لانا چاہتے تھے۔ لیکن ان سب منصوبوں پر پانی پھر گیا۔

کلے ٹن نے اس موقع پر ایک چال چلی۔ اس نے کہا کہ انگریز اور فرانسیسیوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ابن سعود کو اس حصے سے ہٹا کر نجد کے علاقہ کو ذرا پیچھے ہٹا دیں۔ یہ گویا ابن سعود کو کھلی دھمکی دی جا رہی تھی۔ اب تک وہ خندہ پیشانی سے ہم کلام تھا، اب اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اس نے اپنے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ سب جنگ کے لیے تُلے کھڑے تھے۔ اگر چاہتا تو سب لوگ خوشی سے انگریزوں کے خلاف میدان میں اتر جاتے۔ مگر یہ فعل سراسر عقلمندی کے خلاف تھا۔ انگریزوں کی قوت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جدہ، ینبوع اور مدینہ ابھی اس کے قبضہ میں نہ تھے۔ اس کے علاوہ بغداد میں فیصل اور اس کا بھائی عبداللہ دونوں اس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور حسین کی طرف سے کسی نہ کسی طرح انہیں امداد پہنچ رہی تھی۔

ایک لمحہ میں یہ سب حالات ابن سعود کے آگے آ گئے وہ مسکراتے ہوئے کلے ٹن کی طرف پلٹا، اور اس حصہ سے کنارہ کشی منظور کر لی۔ اس کے بدلہ میں انگریزوں نے اسے وادئ شیریں اور ردئیلہ قبائل کا مختار تسلیم کیا۔

حسین کا بیٹا علی ابن سعود کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد سارے حجاز کو اپنے قبضہ میں لالے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ دنیا کے تمام مسلمانوں سے حجاز کے نظم ونسق سے متعلق مشورے طلب کیے اور اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے انہیں حجاز آنے کی دعوت دی۔ ایک سال تک کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابن سعود نے پھر سے دعوت کی تجدید کی۔ اس مرتبہ بعض ممالک نے صاف انکار کر دیا، بعضوں نے کچھ بہانہ کیا اور چند نمائندے جو آ گئے انہوں نے طرح طرح کے بے معنیٰ اعتراضات شروع کر دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی چھوٹے مسئلہ پر بھی متفق نہ ہو سکے ان کا زیادہ تر وقت غیر حقیقی اور بے بنیاد اختلافات کی نذر ہو گیا۔ اس کے باوجود ابن سعود نفاق پیدا کرنے کو گناہ سمجھتا رہا اور اس بات کا آرزومند تھا کہ اسلام میں ایک اتحاد پیدا ہو جائے چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے ایک عام جلسہ میں قرآن حکیم کی ایک آیت بے ساختہ تلاوت کی جس کا منشا یہ ہے کہ "خدا کے حکم کی سختی سے تعمیل کرو اور علیحدہ مت ہو خدا نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اسلام اور اتحاد عطا فرمایا ہے"

ابن سعود کے ساتھی بھی ان باتوں سے بیزار آ گئے تھے، وہ کہتے تھے کہ حجاز کو ہم نے اپنا خون بہا کر آزاد کرایا ہے،

پھر کیا وجہ ہے کہ دوسروں سے اس کے متعلق گفتگو کی جائے جب کہ وہ خود اس معاملے کی یکسوئی کرنا نہیں چاہتے ؟ علماء، وہابی الاخوان اور نجد کے تمام جاں نثار، حجاز کو سوائے ابن سعود کے کسی دوسرے کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے تھے۔ خود حجازی بھی اس کے لیے راضی نہیں تھے۔ بالخصوص جب ہندوستان کی طرف سے حجاز میں بین الاقوامی جمہوریت قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو ابن سعود، نجدی اور حجازی سب کے سب بھڑک اٹھے اور ابن سعود نے تصفیہ کر لیا کہ یہ بحث فضول ہے، وہ خود بادشاہ بن کر ملک کے سارے انتظامات خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا اور انگریزوں کا مقابلہ کر سکتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے ایک مہمان سے کہا

"اس کا یقین کر لو کہ میرے ملک میں کوئی بیرونی حکومت اپنا سکہ جما نہیں سکتی۔ خدا کے فضل سے میں خود، خود مختارانہ حیثیت سے حکومت کر سکتا ہوں۔

"میں نے اس مسئلہ پر کافی غور کیا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ کسی جگہ کے بھی مسلمان حجاز کی خود مختاری کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ ہندوستانی انگریزوں کے ماتحت ہیں، شامی فرانسیسیوں کے زیر اثر وھوا ھذا۔ اگر میں حکومت کی باگ

ان کے ہاتھ میں دیدوں تو اس کا صریح نتیجہ یہ ہوگا کہ باہر کی عیسائی اقوام ہماری مقدس سرزمین پر اپنے آدمیوں کے ذریعہ حکومت کرینگی۔

"میں نے خدا کی مدد سے، اپنی قوتِ بازو سے اور اپنے ساتھیوں کی جان نثاری سے فتح حاصل کی ہے۔ صرف میں ہی اس سرزمین کو ایک آزاد اسلامی سلطنت کا رنگ دے سکتا ہوں یہ میرا حق اور فرض ہے کہ میں بادشاہ بنوں"

اس کے بعد ابن سعود نے دنیا کے تمام مسلمانوں کے پاس ایک پیغام بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

"حجاز پر حکومت کرنا یا اس کا مالک بن بیٹھنا میری خواہش نہیں ہے حجاز میرے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور یہ اس وقت تک میرے پاس رہیگی جب تک کہ اس ملک کے باشندے اپنے لیے ایک حکمران منتخب نہ کرلیں ـــ ایک ایسا حکمران جو اپنے کو مسلمانانِ عالم کا خادم سمجھتا ہو"

ابن سعود کے سوا دوسرا کون ایسا ہوسکتا ہے؟

(۴)

اپنے تئیں یہ تصفیہ کرلینے کے بعد ابن سعود اپنے کام کی

طرف رجوع ہوگیا۔ مدینہ، ینبوع اور جدہ کی فتح کا مسئلہ اس کے پیشِ نظر تھا۔ ان دنوں دوَیش حج کے لیے مکہ آیا ہوا تھا ابن سعود نے اسے گھر واپس جانے کا حکم دیا کیونکہ یہاں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دویش ذرا آزردہ ہوگیا اور واپس جاتے میں اس نے چند گاؤں پر حملہ کرکے معصوموں اور بیگناہوں کے خون سے اپنے غصہ کی آگ بجھائی، اور فخریہ طور پر اپنی اس کارگزاری کی اطلاع ابن سعود کے پاس بھیجی۔ ابن سعود کو دویش کی یہ نازیبا حرکت بہت بُری معلوم ہوئی اور وہ اسے فوراً واپس چلا جانے کا حکم دیا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا کی دھمکی دی۔ دویش اپنا خون آپ پی کر چلا گیا۔

اس کے بعد ابن سعود نے اپنے لڑکے محمد کو مدینہ روانہ کیا۔ اہل مدینہ نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کی حکومت تسلیم کرلی اور پھر بندرگاہ ینبوع کے باشندے بھی ابن سعود کے ماتحت بن گئے۔

اس وقت علی جدہ میں تھا۔ یہ اپنے کو حجاز کا بادشاہ جتلاتا تھا، اس کے ساتھ حسین کی فوج کے تھوڑے سے سپاہیوں کے علاوہ چند شامی اور ترکی افسر بھی تھے۔ علی نے ابن سعود کے مقابلہ کے لیے خندقیں کھدوالیں، فصیل درست کرائی اور دو ہوائی جہاز بھی خرید لیے تھے۔ لیکن علی میں انتظامی قابلیت سرے سے مفقود تھی۔ اس کے ماتحتین کا بھی یہی حال تھا،

اس وقت جدہ میں حجاج بھرے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کی سخت تکلیف ہورہی تھی۔ علی میں اتنی صلاحیت تو نہ تھی کہ ان امور کا انسداد کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن کے اندر قحط پڑ گیا۔ لوگ سڑکوں پر بھوکے مرنے لگے، طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوگئیں اور ایک عام بدحواسی پھیل گئی۔

جس وقت الاخوان نے مدینہ پر حملہ کیا تو علی کے رہے سہے ہوش پرّان ہوگئے اور سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ علی نے خاموشی ہی میں خیر دیکھی اور انگریزی جہاز پر سوار ہوکر دسمبر ۱۹۲۵ء میں عدن سے ہوتا ہوا اپنے بھائی فیصل کے پاس بغداد پہنچ گیا۔

اس کے بعد ابن سعود نہایت فتحمندانہ انداز میں مدینہ میں داخل ہوا۔ اہل مدینہ نے اس کی اطاعت قبول کی۔ پھر وہ مکۂ معظمہ گیا۔ شرفاء اور علماء نے اس کا استقبال کیا اور کہا کہ حجاز کے باشندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر وہ نہایت تزک و احتشام سے جدہ میں داخل ہوا۔ ابن سعود یہ کرّوفر اس لیے نہیں کررہا تھا کہ یورپی قونصل پر اس کا رعب بیٹھے بلکہ وہ اس لیے نازاں تھا کہ اس نے بے دین، حسین شریف مکہ پر فتح حاصل کی تھی۔ ورنہ وہ ظاہری نمائش اور تکلفات سے طبعاً اجتناب کرتا تھا۔

۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو صبح کے وقت وہ باب صفا کے رستہ سے

جامع مسجد میں داخل ہوکر منبر پر بیٹھ گیا، کچھ دیر وعظ کہتا رہا، پھر شرفاء و علماء کو بلا کر بیعت لی اور نماز ادا کی۔

اس اثناء میں مسجد کے سامنے ایک بڑا مجمع ہوگیا۔ سب کے سامنے اس نے اپنے لڑکے فیصل کو اپنا جانشین قرار دیا اور زیاد کے قلعہ میں اپنے اعزاز میں ایک سو ایک توپیں دغوائیں۔ اس عمل کے اکثر کٹر وہابی چین بہ جبیں ہوگئے حالانکہ اس نے یہ فعل مصلحتاً کیا تھا۔

اب ابن سعود سارے نجد اور حجاز کا سلطان تھا۔

چودھواں باب

اسلامی کانگرس اور مصری محمل

ابن سعود اب سارے نجد اور حجاز کا مالک تھا، اس نے یہ محسوس کیا کہ نجد کی حد تک تو کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں البتہ حجاز کے معاملہ میں دنیا کے تمام مسلمان کا اتحاد ضروری ہے اس نے مکہ میں کانگرس مقرر کی اور تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اب چونکہ ابن سعود نجد اور حجاز کا سلطان تھا اور اندرونی جھگڑے بھی ایک بڑی حد تک دور ہو چکے تھے اس لیے نمائندوں نے بلاخوف و خطر اس کی دعوت پر لبیک کہا۔

اس موقع پر ممتاز ممالک کے کوئی ستر نمائندوں نے شرکت کی۔ ایران یا عراق سے کوئی نمائندہ نہیں بھیجا گیا اور ترکی، یمن، مصر اور افغانستان سے جو نمائندے آئے وہ کچھ دن بعد پہنچے۔

بہر حال ۶ ، جون ۱۹۲۶ء کو سب نمائندے ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے یہ ہال بہت سلیقہ سے سجایا گیا تھا۔ دروازوں پر سبز پردے ڈالے گئے تھے کیونکہ یہ حجاز کا امتیازی رنگ تھا ہال کے ایک حصّے میں ایک پلاٹ فارم بنایا گیا تھا جس کے سامنے نمائندوں کے بیٹھنے کے لیے گھڑ نعلی وضع کی دو نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا کہ نشستوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

پہلے اجلاس میں جب سب نمائندے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، ابن سعود، حافظ وہبہ کے ساتھ بغیر کسی تکلف یا شان وشوکت کے سادگی سے ہال میں داخل ہوا اور سیدھے پلاٹ فارم پر پہنچ کر نمائندوں کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد حافظ وہبہ نے ایک تقریر پڑھی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

" میں نے آپ حضرات کو حجاز کی اخلاقی اور مذہبی بہتری پر غور کرنے اور اس کے متعلق آپ کے مفید مشورے طلب کرنے کے لیے زحمت دی ہے تاکہ خدا اور بندگانِ خدا دونوں خوش ہوں "

اس کے بعد ابن سعود فوراً ہی اسی تیزی سے واپس ہوا جس تیزی سے داخل ہوا تھا۔ اس کے چلے جانے کا مقصد یہ تھا کہ نمائندے دل کھول کر بحث کریں۔ حافظ وہبہ کی تقریر سے ابن سعود کا پورا منشاء ظاہر ہو چکا تھا۔ وہ صرف نمائندوں سے

مشورے چاہتا تھا اور آخری فیصلہ کا حق محفوظ تھا۔ ابن سعود حجاز کے انتظامی یا سیاسی معاملہ میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا کیونکہ پہلی دفعہ جب اس نے نمائندوں کو دعوت دی تھی تو اس کی جداگانہ صورت تھی، اب تو وہ حجاز کا حکمران تھا۔

اس سلسلے میں کئی مباحثے ہوئے۔ اکثر میں ابن سعود نے بھی شرکت کی۔ ابن سعود پر طرح طرح کے سوالات کیے گئے اور وہ ان سب کا جواب دیتا گیا۔ ایک مباحثہ میں ایک نمائندے نے یہ سوال اٹھایا کہ ابن سعود کو سلطان الحجاز بننے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس پر ابن سعود نے اس نمائندے کو جواب دیا۔

"کیا آپ میں سے کوئی ایسا ہے جو اس ارض مقدس میں امن قائم رکھنے یا اسے بیرونی حملوں سے بچانے کی ضمانت دے سکتا ہے؟"

اس سوال پر کسی کی گردن نہ اٹھی تو ابن سعود نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر میرا فرض ہے کہ یہاں کا سلطان بنوں۔ صرف میں ہی اس سرزمین میں بحیثیت ایک آزاد حکمران کے حکومت کر سکتا ہوں۔"

اس کے بعد ابن سعود نے پھر سے ایک مرتبہ اپنے مافی الضمیر سے نمائندوں کو آگاہ کر دیا اور کہا

"میں نے آپ کو صرف اس لیے زحمت دی ہے کہ
آپ حضرات اس ارض مقدس کو اسلامی تہذیب کا
گہوارہ بنانے سے متعلق مشورہ دیں ۔ اس سے آگے
جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

اکثر نمائندوں نے جدہ سے مکہ تک ریل ڈالنے کی صلاح دی ۔ ابن سعود نے اسے بہت پسند کیا اور خود اس کا انتظام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ اس کے بعد نمائندوں نے کہا کہ ہم لوگ اپنے اپنے ملک سے کثیر رقم جمع کرینگے اور حجاج سے جو آمدنی وصول ہوتی ہے اگر وہ بھی ہمارے ہاتھ میں دیدی جائے تو اس مشترکہ رقم سے حجاز میں اصلاحی کام کا آغاز ہو سکتا ہے ۔ ابن سعود سمجھ گیا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں ۔ اس نے کہا کہ اچھی بات ہے ' آپ لوگ پہلے اپنے فنڈ جمع کرکے مجھے بتلائیں پھر میں آپ سے حج کی آمدنی سے متعلق گفتگو کرونگا ۔

ابن سعود کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ یہ نمائندے خود آپس میں عمر بھر تک متفق الخیال نہیں ہو سکتے ۔ ایسا ہی ہوا ۔ کانگرس کے اجلاس کیا ہوتے تھے ' اچھا خاصا دنگل بن جاتا تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نمائندے اصل مقصد سے ہٹ کر جزئیات پر زور دیتے اور انہی کے تصفیہ میں الجھے رہتے تھے ۔ چنانچہ ترکی نمائندہ کے دیر سے آنے کی وجہ سے حجازی نمائندہ کو کرسئ صدارت دی گئی تھی ۔

جب ترکی نمائندہ آگیا تو مطالبہ کیا گیا کہ حجازی کو ہٹا کر ترکی نمائندے کو اس کی جگہ دی جائے۔ بعض نمائندوں نے اصرار کیا کہ بحث و مباحثہ اردو یا انگریزی میں ہو تو دوسروں نے عربی کے لیے زور دیا۔ وہابی عقائد کے متعلق تلخ بحثیں ہونے لگیں۔ کانگرس کے انتظامات پر نکتہ چینیاں کی گئیں۔ بعض ممالک نے مطالبہ کیا کہ ہمارے پاس مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے کانگرس میں ہمارے نمائندے زیادہ ہونے چاہییں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس سے اس کے بجائے کہ کوئی سودمند نتیجہ نکلتا الٹی رنجش پیدا ہو گئی۔

ابھی یہ قضیے چکے نہ تھے کہ ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ حج کا زمانہ تھا۔ مصری قاہرہ سے محمل[1] لا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مصریوں کا فوجی دستہ اور ایک جنگی توپ بھی تھی۔ دستور یہ تھا کہ محمل کو حج کے دن وادیٔ ابطح سے ہوتے ہوئے قصبۂ مِنیٰ

---

[1] محمل ایک مستطیل ڈبہ ہے جس کے اوپر کا حصہ ڈیرے کے مانند ہوتا ہے، اسے اونٹ پر رکھ کر ہر سال مکہ لایا جاتا ہے، اس کے ہمراہ مسلح مصری فوج اور توپیں ہوتی ہیں۔ اس محمل کی اصل یہ ہے آج سے چھ سو سال قبل محمل، مصری ملکہ، ملکۂ شجرۃ الدُر کی سواری تھی۔ اب قدیم دستور کے مطابق مصری حجاج اسے اپنا نشان بنا کر ساتھ لاتے ہیں،

سے گذر کر عرفات کے پہاڑ پر لے جایا جاتا تھا۔ مصری محمل کو عرفات لے جا رہے تھے۔ رستہ میں انہوں نے مینا پر قیام کیا کیونکہ ان کے اکثر ساتھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ حجاج کا اژدحام تھا۔ سب کو آسانی سے ایک جگہ جمع کرنا مشکل کام تھا اسی لیے مصری سپاہیوں نے اپنے آدمیوں کو اطلاع دینے کے لیے بگل بجائی۔ وہابی اس پر بگڑ بیٹھے۔ یہ لوگ موسیقی کے سر سے خلاف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں کا ایک گروہ محمل کے قریب آکر اس کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ کسی نے کہا یہ بت ہے، مصری باجا بجا کر اس پوجا کر رہے ہیں۔ چند آدمیوں نے محمل پر پتھر برسائے۔ مجمع آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ مصری افسر نے وہابیوں کو ہٹ جانے کے لیے کہا لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور بدستور پتھر برساتے رہے۔ مصری افسر کو بہت غصہ آیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جس سے پچیس آدمی اور چالیس گھوڑے ہلاک ہوئے اور ایک کثیر تعداد زخمی ہوئی۔

اس حادثہ کی خبر آن واحد میں چوطرف پھیل گئی نجدی اور الاخوان اپنے بھائیوں کو مدد دینے کے لیے جوق درجوق آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے مینا میدانِ کارزار بن گیا۔

ابن سعود مینا کے باہر اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ گولیوں

کے چلنے کی آواز سن کر اس نے اپنے لڑکے فیصل کو تیزی کے ساتھ روانہ کیا۔ فیصل نے یہاں آکر دیکھا تو معاملہ بہت اہم اور نازک ہوگیا تھا۔ اس سے کچھ بن نہ پڑی۔ فوراً اس نے اپنے والد کو امداد کے لیے بلا بھیجا۔

ابن سعود نہایت سرعت کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا ہوا مصری افسر کے قریب جاکر کہنے لگا۔

"تم نے کس حق کی بناء پر یہ قتل و خون کیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں ایک حکومت ہے اور اس کا ایک قانون بھی ہے۔ میں حکمران ہوں۔ اگر تم مجھے اس کی اطلاع دیتے تو سب کچھ ٹھیک ہوجاتا۔"

ابن سعود غصّہ سے کانپنے لگا۔ چاہتا تو مصریوں کا خاتمہ کردیتا۔ مگر صبر و ضبط سے کام لے کر کہنے لگا۔

"یہ شیخی کی جگہ نہیں ہے، یہ مقدس سرزمین ہے جس پر کسی کا خون بہایا نہیں جاسکتا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور ہماری امان میں ہو ورنہ کبھی کے اپنے کیے کی سزا بھگت لیے ہوتے۔"

یہ کہہ کر ابن سعود نے مصریوں اور الاخوانیوں کے درمیان ایک فوجی دستہ چھوڑ دیا اور انتظامات اپنے لڑکے فیصل اور

اور حافظ وہبہ کے سپرد کر کے خود خیمہ کو واپس لوٹ گیا۔

مصریوں کی یہ حرکت ابن سعود کو سخت ناگوار گذری۔ وہ مسلمانوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کا آرزومند تھا لیکن اس جھگڑے سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی بلکہ محبت اور خلوص بڑھنے کی بجائے اُلٹے جھگڑے پیدا ہو گئے۔

پندرہواں باب

اصلاحِ حجاز

(۱)

حجاز کے جنوب میں عسیر واقع ہے اور اس کے جنوب میں یمن۔ یمن پر امام یحییٰ کی حکومت ہے۔ یمن اگرچہ ایک پہاڑی ملک ہے تاہم ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہاں اچھی بارش ہوتی ہے اور وہ زرخیز بھی ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے بہادر اور جنگجو ہیں۔ برخلاف اس کے عسیر غریب ملک ہے اور خانگی جھگڑوں کے باعث اس کی حالت بہت سقیم اور کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے اس میں ایک ترکی فوج مقیم تھی لیکن تھوڑے دن بعد وہ بھی چلی گئی۔ عسیر پر محمد ادریسی کی حکومت تھی، اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا حسن ادریسی جانشین ہوا جو بہت ہی

نا اہل، کمزور اور بدنام شخص تھا۔ حجاز کی فتح کے بعد ابن سعود نے شمال کی جانب سے عسیر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ جنوب کی طرف سے امام یحییٰ نے اس پر قبضہ جمانے کی کوشش شروع کردی۔ اس طرح ۱۹۲۶ء میں اہل عسیر کے آگے یہ سوال پیش ہوا کہ ساتھ دیں تو کس کا؟ ابن سعود کا یا امام یحییٰ کا؟ ابن سعود کا پلہ بھاری تھا۔ اس کی بہادری اور انصاف کے چرچے سارے اقطاع عرب میں عام ہوتے جارہے تھے۔ اسی لیے اہل عسیر آنکھ بند کر کے ابن سعود کے ساتھ ہوگئے۔

اب مقابلہ ابن سعود اور امام یحییٰ کے مابین تھا لیکن اس وقت دونوں جنگ کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انہوں نے آپس میں تصفیہ کرلیا کہ جو حصّہ پہلے ہی سے امام یحییٰ کے قبضہ میں تھا وہ تو ویسے ہی بحال رہے اور باقی پر ابن سعود کی حکومت ہو۔ اس طرح کا سمجھوتہ ایک طرح سے ابن سعود کے حق میں مفید ثابت ہوا کیونکہ ریاض سے نکلے ہوئے اسے کوئی دو سال کا عرصہ ہوچکا تھا، اہل نجد میں ایک طرح کی بدگمانی پھیلتی جارہی تھی کہ حجاز کی آمدنی کے لالچ میں ابن سعود نجد کو بھولتا جارہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دویش نے ابن سعود کے خلاف کارروائی شروع کردی تھی۔ ہتلان بھی اسی کا ساتھ دے رہا تھا اور یہ دونوں مل کر آل عجمان کو ابن سعود کے خلاف اکسا رہے تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ فیصل بغداد

بھی اپنے بھائی کے ساتھ سرحدی قبائل میں جال پھیلا رہا تھا۔ ابن سعود کے حق میں یہ باتیں سخت مُضر تھیں۔ ان حالات کے تحت عبدالرحمٰن اور مشیرانِ سلطنت نے ابن سعود کو فوراً ریاض آنے کے لیے لکھ بھیجا۔ ابن سعود امام یحییٰ سے معاہدہ کر کے فوراً ریاض پہنچا۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد ابن سعود سیدھا دربار کے وسیع کمرہ میں داخل ہوا جہاں قبائل کے سردار اور دیگر اکابر سلطنت جمع تھے۔ ہر شخص ابن سعود پر اعتراضات کرنے کے لیے تلا ہوا تھا لیکن جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ ابن سعود نے ان کی صورتوں کو دیکھ کر ان کے دلوں کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور نہایت سنجیدگی اور متانت سے سب کو خوش آمدید کہا اور حسبِ عادت اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا کر گرجتی ہوئی آواز میں تقریر کرنے لگا۔ حجاز کی فتح، حسین کی پسپائی اور حج بیت اللہ کے واقعات نہایت موثر انداز میں بیان کیے۔ یہ سُن کر سب کے شکوک رفع ہو گئے اور سبھوں نے ہم آواز ہو کر ابن سعود کو مبارکباد دی۔ ابن سعود نے مسکراتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کیا۔ مجلس برخواست ہوئی اور سب لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس کے بعد ابن سعود نے چند دن کے اندر اکثر بڑے اور چھوٹے گاؤں کا دورہ کیا اور اہل قبائل سے مل کر ان کے شکوک رفع کرتا گیا۔ اس طرح سے سب لوگوں کو مطمئن کر کے وہ پھر سے مکہ پہنچا تاکہ ضروری امور کا تصفیہ کرے۔

(۲)

حسین شریف مکہ کے زمانہ میں حجاز کی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار، چوری، ڈاکہ کا بازار گرم تھا۔ مسافر کبھی اطمینان سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ہر سال کئی حاجی لقمۂ اجل بنتے تھے۔ قتل و غارت ایک معمولی سی بات تھی۔ خصوصاً عدمِ تنظیم کے باعث بے رحم بدویوں کے ہاتھ حاجیوں نے وہ وہ مصیبتیں اٹھائیں کہ عرصہ تک اس کی دہشت دلوں سے محو نہ ہو گی، کیوں نہ ہو؟ جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا وہاں لٹیرے ہی راج کرتے ہیں۔

اسی لیے ابن سعود کے آگے سب سے پہلے مسافرین کی حفاظت اور امن عامہ کا سوال پیش تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر شہر اور ہر گاؤں میں الاخوانی پولیس کے پہرے لگا دیے۔ شرعی سزاؤں کی تفصیل کا اعلان کر دیا گیا اور عوام میں اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا گیا۔ الاخوانی اصول اور قانون کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ قانون کے آگے

وہ شخصیت، اثر، مال و دولت غرض کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ قرآن پاک اُن کا قانون ہے اور اس کی پابندی کرانا ان کا مقدس فرض۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس انتظام سے بڑے بڑے لٹیرے اور بدمعاش تک کانپنے لگے اور قافلے لوٹنا تو خیر بڑی بات ہے کسی ڈاکو کی یہ جرارت نہیں ہوتی کہ وہ تنہا آدمی پر حملہ کرے۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ بڑے بڑے قافلے ایک منزل سے دوسری منزل تک جان ہتیلی پر لے کر جاتے تھے اور کثیر رقم رشوت دینے کے باوجود کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صحیح و سالم اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے گا۔ لیکن برخلاف اس کے آج ایک شخص تنہا عرب کے کسی خطہ میں بھی سونا اچھالتے ہوئے جا سکتا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے ہاتھ لگائے!

اس انتظام کے بعد ابن سعود نے حاجیوں کو سہولتیں بہم پہنچانے کی طرف توجہ دی۔ بنی حرب حاجیوں سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ ابن سعود نے انہیں روک دیا۔ اور خود پیسہ وصول کر کے موٹروں اور اونٹوں کا انتظام حکومت کی جانب سے کرنے لگا۔ سڑکوں کا کام شروع کر دیا گیا، جا بجا پانی کے چشمے بنوائے اور دوا خانے قائم کیے۔ مدینہ اور مکہ میں سماج کی اصلاح کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں اور عام صفائی اور نماز کی پابندی کی نگرانی ان کمیٹیوں کے اراکین کے ذمہ کر دی

گئی۔ بے نمازیوں کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ نماز کے وقت دوکاندار اپنی دوکانیں کھلی چھوڑ کر اطمینان سے مسجد چلے جاتے ہیں اور کیا مجال کہ ایک رتی بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ کیا آج دنیا کی کوئی متمدنہ قوم دیانت یا حسنِ انتظام کا کوئی ایسا نمونہ پیش کر سکتی ہے؟

سب سے پہلے ابن سعود نے حجاز میں ایک مجلس عاملہ قائم کی اور اس کا صدر اپنے لڑکے فیصل کو بنایا۔ اس کے بعد مکہ، مدینہ، جدہ، ینبوع اور طائف میں علیحدہ علیحدہ ذیلی مجلسیں قائم کیں اور ان سب کا تعلق صدر مجلس سے کر دیا اور ہدایت کر دی کہ ہر قسم کی اطلاعات فوراً صدر مجلس کو دی جایا کریں اور سب کارروائیاں صدر مجلس ہی کے مشوروں پر کی جائیں۔

اس زمانہ میں ابن سعود بہت کام کرتا رہا۔ روزآنہ اٹھارہ گھنٹے مصروف رہتا اور بہت کم آرام لیتا تھا۔ کاروبار میں مزید سہولت پیدا کرنے کی خاطر اس نے ایک موٹر خرید لی اور زیادہ تر موٹر ہی میں سفر کرنے لگا۔ اس کی عمر اس وقت سینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اب بھی جوانوں کی طرح چست اور توانا تھا اپنے احکامات کی تعمیل کرانے میں بھی وہ پہلے کی طرح بہت سخت تھا۔ اگر کوئی ذرا شش و پنج کرتا تو بُری طرح اس کی خبر لیتا۔ چنانچہ ایک دفعہ الاخوان کی

ایک جماعت کو ینبوع پر محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ حج کا زمانہ تھا، الاخوان کچھ بڑ بڑانے لگے۔ ابن سعود نے محافظ دستہ کے ایک سپاہی کے پاس سے تلوار لے کر اسے نیام سے باہر نکالا اور کہا خدا کی قسم تمہیں ینبوع جانا ہوگا۔ اگر تم میں سے ایک کو بھی یہاں دیکھونگا تو اسی طرح اس تلوار سے ختم کرونگا جس طرح تمہارے اجداد کی خبر لی گئی ہے، چلے جاؤ" الاخوان خاموشی سے سر نیچا کر کے چل دیے۔

اب ابن سعود اپنی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے ضرورت تھی کہ وزراء اور عہدہ داروں کا تقرر کر دیا جائے۔ تنہا ابن سعود اس بوجھ کو کیسے سنبھال سکتا، اس مقصد کے لیے اس نے عہدہ داروں اور وزیروں کا انتخاب پہلے عرب سے کیا اس کے بعد مصر، عراق اور ترک کے بھی بعض سنجیدہ اور کارگزار مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں۔

ابن سعود کو اپنے بیٹوں پر کافی اعتماد تھا بالخصوص ولیعہد سعود پر۔ ان دونوں میں ایک قسم کی یکسانیت تھی، دونوں بلند قامت، تنومند، مستقل مزاج اور بہادر تھے۔ ابن سعود کی عدم موجودگی میں اس نے ریاض پر نہایت عمدگی سے حکومت کی اور اہل قبائل سے اس طرح کا برتاؤ کیا کہ سب اس سے محبت کرنے لگے۔ فتح حائل کے وقت بھی اس نے بہادری کے

خوب جوہر دکھلائے تھے ۔ باپ کی طرح یہ بھی سخت مذہبی تھا۔

۴

حجاز اور نجد کے باشندے ایک دوسرے کے مخالف تھے ۔ حجازی نجدیوں کو وحشی کہتے تھے اور نجدی حجازیوں کو بدعتی۔ ایک طرح سے حجازی روشن خیال تھے لیکن نجدی سخت مذہبی۔ ابن سعود نے اسی لیے مکہ میں وزارت خارجیہ قائم کی کہ ایک تو وہ جدہ میں رہنے والے بیرونی قونصلوں سے معاملت کر سکے اور دوسرے اس نے مکہ کو ریاض پر اس لیے بھی ترجیح دی کہ نجدی مغربی اثرات اور بیرونی ممالک کے باشندوں کی آمدورفت سے کہیں برہم نہ ہو جائیں ۔ اسی خاطر ابن سعود نے اہل نجد کو ان معاملات سے دور رکھنا ہی مناسب خیال کیا۔

ابن سعود بذات خود بہت روشن خیال تھا اور دنیا کی ترقی کے ساتھ خود بھی ترقی کرنا چاہتا تھا ۔ وہ کسی طرح قدامت پسند نہ تھا چنانچہ وہ کہا کرتا تھا

"میری تمام حکومت قرآن اور حدیث پر مبنی ہے ۔ ان میں کسی جگہ بھی ترقی کی ممانعت نہیں کی گئی ۔ اور نہ ہی ان میں مشینری ، لاسلکی یا اسی قسم کی چیزوں کے استعمال کے امتناعی احکامات ہیں"

ابن سعود جانتا تھا کہ اگر عرب کو ترقی کرنا ہے تو پھر جدید

آلات حرب کا استعمال کرنا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کام کرنا اس کے لیے ناگزیر ہے ایک موقع پر اس نے دوران تقریر میں کہا " مسلمان اب خواب سے بیدار ہو رہے ہیں، انہیں دو حربوں کو اپنے قابو میں رکھنا چاہیے، ایک تو خدا کے احکامات اور ان کی پرخلوص تعمیل اور دوسرے طیارے اور موٹر جیسے مادی ہتھیار"

اہل حجاز کو تو اس میں کچھ تامل نہ تھا البتہ اہل نجد اسے قبول نہ کرتے تھے۔ تاہم ابن سعود نہایت احتیاط سے اپنے خیالات سے انہیں روشناس کراتا گیا۔ اس میں امان اللہ کی سی جلد بازی نہ تھی۔ وہ ہر کام کو سوچ سمجھ کر کیا کرتا تھا۔ ہر معاملہ میں وہ علماء سے مشورے کرتا، پہلے ان کو رام کرتا اور پھر انہیں سے ان باتوں کی تحریک کرواتا تھا۔ پھر اہل نجد کو دم مارنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اس طرح سے ابن سعود نے آہستہ آہستہ یہ مہم سر کی اور ٹیلیگراف، ٹیلیفون، لاسلکی، موٹر، طیارے وغیرہ سے اپنے لوگوں کو روشناس کرایا۔

اس کے بعد قرآن حکیم کو پیش نظر رکھ کر، اس نے علماء کے مشوروں سے ملکی قانون مدون کیا۔ حجاز اور نجد کو علیحدہ علیحدہ صوبے قرار دیا۔ سعود کو نجد کا وائسرائے اور فیصل کو حجاز کا وائسرائے بنایا اور خود ان دونوں کا مختار بن گیا۔ لیکن اس

اقتدار وحکومت کے باوجود اس نے اپنی پالیسی نہیں بدلی بلکہ تمام مذہبی معاملات میں علما ہی سے مشورہ کرتا رہا البتہ ملکی اور سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر اپنی رائے پر کام کرتا تھا۔

روسیوں نے ابن سعود کی حکومت اور اس کی سلطنت کے نظم ونسق کو دیکھ کر اسے حجاز کا شہنشاہ تسلیم کیا۔ اسی طرح انگریزوں، فرانسیسوں اور جرمنوں نے بھی اسے نجد و حجاز کا سلطان تسلیم کیا۔ اسی طرح یمن اور ریگستانِ اعظم کے تھوڑے سے جنوبی حصّہ کو چھوڑ کر ابن سعود تمام عرب پر — بحیرۂ قلزم سے خلیج فارس تک اور ریگستانِ اعظم سے شام کی سرحد تک قابض ہو گیا۔

سولہواں باب

بغاوتیں

۱

جب ابن سعود کی شہرت معراجِ کمال پر پہنچ گئی اور ہر طرف سے اسے اطمینان ہو گیا تو پھر سے نئے نئے فتنے برپا ہونے لگے۔ یہ فتنے اسی زمانہ میں جڑ پکڑ چکے تھے جبکہ ابن سعود حجاز میں تھا۔ اس کی واپسی کے بعد معاملات بڑی حد تک سلجھ چکے۔ تاہم دویش اپنی ریشہ دوانیوں کے جال برابر پھیلائے جا رہا تھا اور اپنے ساتھ قبائل مطیر اور الاخوان کے چند لوگوں کو لے کر ابن سعود سے اپنی ہتک کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ آل مطیر ابن سعود سے اس لیے نالاں تھے کہ اس نے مدینہ میں انہیں لوٹ مار، قتل و غارت سے منع کیا تھا۔ ہتلان عجمانی بھی اسی طرح اپنی شکستوں کا

انتقام لینے کے لیے تُلا ہوا تھا۔ قبائل عتیبہ کا شیخ، بجاد، ابن سعود سے اس لیے خفا تھا کہ ابن سعود نے حجازیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کیا حالانکہ اس کے خیال کے مطابق تمام حجازیوں کے ساتھ طائف والوں کا سا برتاؤ کیا جانا چاہیے تھا۔ ہتلان اور بجاد نے دویش کا ساتھ دیا کیونکہ دویش کی ماں عجمانی عورت تھی اور اس کی بیوی کا تعلق عتیبہ سے تھا۔ اس طرح یہ تینوں ایک حیثیت سے رشتہ دار تھے۔ دویش کے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس نے ان دونوں کو ارطاویہ بلا کر مشورہ کیا اور ابن سعود کو ڈانٹ کر ایک خط لکھا کہ اس کے تمام افعال غیر مذہبی ہیں، حجاز میں وہابی زندگی پیدا کی جانی چاہیے، ٹیلیفون، لاسلکی، طیارے وغیرہ سب نیست و نابود کر دیے جائیں، تمباکو پر جو ٹیکس لگایا جاتا ہے اور حاجیوں سے جو رقم لی جاتی ہے وہ یک لخت بند کر دی جائے۔ اہل عراق کے خلاف جہاد کا حکم دے دیا جائے کیونکہ فیصل انگریزوں کا آلۂ کار ہے اور عراقی بالعموم نجدی قافلوں کو لوٹ کر طرح طرح کی تکالیف دیا کرتے ہیں۔

یہ خط پڑھ کر ابن سعود غصّہ کے مارے کانپنے لگا لیکن ایسے موقعوں پر وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ دویش اور اس کے ناعاقبت اندیش ساتھیوں کا یہ لہجہ، ابن سعود

جیسے مقتدر حاکم کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو ذرا بھی ششں وپنج کیے بغیر دویش کو اس کی اپنی طفلانہ حرکت کا مزہ چکھانے کے لیے تیار ہو جاتا لیکن ابن سعود نے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے غور کیا کہ اگر ان لوگوں کی کھلی مخالفت کی گئی تو یقیناً وہ عرب کے نصف حصہ کو اس کے خلاف اُکسا دینگے۔

مخالفین کی قوت کو توڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں خود آپس میں پھوٹ ڈال دی جائے۔ بجاد سیدھا سادھا مسلمان تھا علماء کے ذریعہ اسے ٹھیک کر لینا کوئی ایسا زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ البتہ ہتلان سے صفائی ناممکن تھی کیونکہ وہ ابن سعود کا سخت دشمن تھا۔ بہرحال ابن سعود نے نہایت سنجیدگی کا جواب دیا کہ یہ سارا معاملہ علماء کی مجلس میں ان کی رائے کے ساتھ پیش کردیا جائیگا۔ دویش، ابن سعود کی اس پالیسی کو سمجھ گیا۔ اور فوراً ہتلان اور بجاد کو بلا کر بھڑکانا شروع کیا کہ ابن سعود نے عراقیوں سے معاہدہ کرلیا ہے، وہ انگریزوں کا دوست ہے اوران کے ساتھ مل کر بغداد سے مکہ تک ریل کی پٹڑی ڈالنے کا خیال رکھتا ہے۔ اس طرح سے ریگستان کی آزادی سلب ہو جائیگی، نیز اس صلہ میں ابن سعود نے انگریزوں کو نجد کا نصف حصہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔

اس اثناء میں ابن سعود نے دویش کو اطلاع بھیجی کہ وہ

ریاض آکر علماء کے آگے اپنے اعتراضات پیش کرے۔ دویش بادل ناخواستہ ریاض آیا۔ اس کے ساتھ تین سو بہادر جنگجو ہمرکاب تھے۔

ابن سعود نے شاہی محل کے میدان میں دویش سے ملاقات کی۔ اس کے بھی سپاہی سلح اور ہر طرح سے تیار تھے۔ لیکن اس وقت ابن سعود دویش کے آگے بالکل تنہا کھڑا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے پُرزور الفاظ میں ابن سعود سے گفتگو شروع کردی اور ایک ایک کرکے اس کی خامیوں کو گنانے لگا اور عراق کے خلاف جہاد اور محصول خانوں اور ٹیلگراف اور ٹیلیفون کو برخاست کر دینے کا نہایت شد و مد سے مطالبہ کیا۔ ابن سعود آہستہ آہستہ دویش کی باتوں کا جواب دے رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دویش بھی نرم پڑتا گیا۔ بالآخر ابن سعود نے علماء کو بلوایا، دویش اور اس کے ساتھیوں نے ان کے آگے اپنے اعتراضات پیش کیے۔ جس پر علماء نے تصفیہ کیا کہ محصول اڑا دیا جائے اور حجاز پر وہابی حکومت قائم ہو۔ ٹیلیفون کے متعلق انہوں نے کہا اس کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر نہ ہو تو اور بھی اچھا ہے، اب رہا جہاد کا مسئلہ، تو اس کے متعلق علماء نے کہا کہ یہ مسئلہ ابن سعود سے متعلق ہے کیونکہ وہ امام وقت ہے۔

ابن سعود نے علماء کی ایک بات بھی نہیں کاٹی بلکہ فوراً
ان کے تصفیہ پر عمل شروع کر دیا۔ حجاز میں وہابی حکومت
کر دی۔ مدینہ سے باہر جو لاسلکی اسٹیشن بنے تھے، انہیں
توڑ دیا اور جہاد کے متعلق اپنی رائے مخالفت میں دے دی۔
دویش اس سے اب بھی ناراض رہا اور جہاد کا ارادہ ظاہر
کیا جس پر ابن سعود نے فوراً علماء کو اکٹھا بلوایا جو بہت علماء کے
تصفیہ کے خلاف تھی۔ علماء دویش کی اس حرکت پر بہت
بگڑے اور قبائل کے ملاؤں کو لکھ بھیجا کہ وہ اہل قبائل کو دویش
کے خلاف ابھاریں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اکثر قبائل دویش کے
مخالف ہو گئے اور خود قبیلۂ مطیر میں دو گروہ ہو گئے ایک
ابن سعود کے موافق اور دوسرا دویش کے موافق۔ اس طرح
دویش کی قوت پارہ پارہ ہونے لگی اور ابن سعود بھی یہی چاہتا تھا۔

— ۴ —

ابھی ابن سعود، دویش کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھا
کہ ایک نیا شگوفہ کھلا۔ کاکس سے ابن سعود کا یہ معاہدہ ہوا تھا
کہ نجد اور عراق کے مابین حد قائم کی جائے اور ایک حصہ بالکل
آزاد رہے تاکہ دونوں سے استفادہ کر سکیں نیز اس علاقہ
میں کوئی قلعہ وغیرہ تعمیر نہ کیا جائے۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں عراق
نے انگریزوں کی مرضی کے مطابق اپنے آدمی روانہ کیے کہ وہ

بوسئی کے چشموں کے پاس ایک پولیس اسٹیشن تعمیر کریں۔ یہ چشمے اس آزاد علاقہ میں واقع تھے۔ پہلے ہی سے مطیر عراق کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے، اب جو انہوں نے عراقیوں کو اپنی آزادی میں حائل دیکھا تو حملہ ہی کر بیٹھے اور کئی مزدور اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیے۔ انگریزوں نے بغداد کی طرف داری کی اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ قبائل مطیر پر بم برسانے لگے۔

دویش کو تو اب موقع ملا۔ وہ فوراً عراق پر دس پانچ حملے کر کے بہت سا مال غنیمت لوٹ لایا۔ ہر دفعہ انگریزوں نے اس کا پیچھا کیا اور اس طرح سے کئی گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر اکثر قبائل دویش کے ساتھ ہو کر عراقیوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دویش نے ایک بڑی کافی بے قاعدہ فوج کے ساتھ پڑتے پانی میں عراق پر حملہ کر دیا اور جو بھی راستہ میں ملا اسے قتل کر دیا۔ کئی گاؤں تباہ کر دیے کھجوروں کے بن کے بن کاٹ ڈالے اور قبیلہ جو اسیر کے تین سو آدمی قتل کر ڈالے۔

انگریز ہوائی جہازوں سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے نجد کے علاقے میں ارطاویہ تک پہنچ گئے۔ اس اثناء میں دویش نے کویت کو اطلاع بھیجی کہ بندرگاہ کو اس کے لیے چھوڑ دیا جائے

ورنہ کویت پر بھی حملہ ہو جائیگا لیکن اہلِ کویت نے اس کی ایک نہ سنی اور دروازے بند کر لیے اور انگریزوں نے ان کے لیے ایک جنگی جہاز روانہ کیا۔ عراق کی سرحد پر تمام قبائل دویش سے خوف زدہ تھے، مطیر بھی بے قابو ہو گئے، عجمان بھی تیار ہو گئے اور بجاد تین ہزار آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا۔

— ۳ —

اس وقت ابن سعود ریاض میں تھا، جیسے ہی اسے یہ خبر ملی وہ سمجھ گیا کہ اس وقت بہت جلد معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے ورنہ نجد کے حق میں بُرا ہوگا اور خواہ مخواہ انگریزوں سے جنگ کرنی پڑیگی اور سارا عرب پھر سے جنگ وجدل، لوٹ مار کا بازار بن جائیگا۔

ابن سعود نے بغداد میں انگریزوں کے پاس ایک خط روانہ کیا اور معاملات کی یکسوئی کے لیے فوراً ایک کانفرنس منعقد کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور ادھر بڑی مشکل سے بجاد کو حملہ سے روکا۔ دویش بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا اور ابن سعود کے کہنے کے مطابق خاموش رہا بلکہ اپنی عقیدتمندی کے اظہار کے لیے اس نے تھوڑا بہت لوٹا ہوا مال بھی واپس کر دیا۔

انگریزوں نے سر گلبرٹ کلے ٹن کو جدہ روانہ کیا۔ کلے ٹن نے دویش اور اس کے حملوں کی سخت شکایت کی۔ ابن سعود نے

سمجھایا کہ اگر یہ معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ سب کچھ ٹھیک کر دیگا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ عراقیوں اور شمریوں کو معاہدہ کے خلاف بوسئی پر پولیس اسٹیشن بنانے کی کیا ضرورت تھی، دوسرے انگریزوں کو اس کا کیا حق تھا کہ باوجود امن وصلح کا معاہدہ ہو لینے کے جو انہوں نے طیاروں کے ذریعہ عرب کے شہریوں کو نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد ابن سعود نے صاف بتلا دیا کہ طیاروں پر سے پرچے پھینک کر دھمکیاں دینے سے کیا حاصل جبکہ اس قبائل پڑھنا نہیں جانتے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تو اکثر قبیلے میرے ہاتھ میں لیکن یہی طرزِ عمل رہا تو وہ کسی کی نہ سنینگے اور مرتے دم تک حملہ کرتے ہوئے عراق کی طرف آگے بڑھتے جائینگے اور ایسا حملہ کرینگے کہ پھر کوئی قوت ان کو روک نہ سکیگی۔

تمام موسم گرما ابن سعود اور کلے ٹن کے درمیان یہی گفتگو ہوتی رہی لیکن سب لاحاصل۔ عراقی پولیس اسٹیشن بنانے کے لیے تلے ہوئے تھے۔ انگریز بھی اس پر زور دے رہے تھے لیکن ابن سعود نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بالآخر حج کا زمانہ آگیا اور ابن سعود حج کے لیے مکہ گیا۔ مکہ جانے سے اس کا دوسرا مقصد یہ بتلانا بھی تھا کہ وہ اس معاملہ کو کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھتا حالانکہ معاملہ بہت پیچیدہ اور اہم تھا۔ اس کانفرنس

سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دویش پھر سے قبائل کو ابن سعود کے خلاف بھڑکانے لگا۔ خود اہل قبائل بھی بے چین سے ہو گئے حتیٰ کہ علماء بھی جہاد کے مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ اسی اثنا میں عبدالرحمٰن کا بھی انتقال ہو گیا اور علماء پر جو دباؤ اور اثر تھا وہ بھی جاتا رہا ہے۔ صورت حال بالکل نازک ہو گئی۔

حجاز میں بھی بدامنی پھیلنے لگی۔ آل حرب اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ دویش کے لوگوں نے انہیں اور اکسایا۔ شرق اردن میں عبداللہ، ابن سعود سے اپنے باپ کا انتقام لے کر سرزمین حجاز کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے فیصل بغداد کی مالی امداد سے اس نے قبائل روئیلہ میں بے چینی پیدا کر دی۔

اہل حجاز بھی یہ رنگ دیکھ کر بدل گئے۔ انہیں حسین کا زمانہ یاد آ گیا جب کہ لوٹ مار، سٹے بازی سے حاجیوں کا سر مونڈھ کر عیش منایا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے بھی خفیہ سازشیں شروع کر دیں۔ ابن سعود نے ان سازشوں کے قلع قمع کی کوشش شروع کر دی اور سولہ سازشیوں کو شہر بدر کر دیا۔

اسی دوران میں اطالیوں کی ہمت افزائی پر امام یحییٰ نے بھی عسیر کو دھمکی دی اور اس پر قبضہ جما کر ابن سعود کو وہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن ابن سعود کو خوف صرف اپنے ہی لوگوں کا تھا یعنی اہل نجد سے۔ اگر وہ بدل جاتے تو پھر یہ کہیں کا نہ رہتا۔ یہ سوچ کر ابن سعود نے تمام نجد میں پروانے روانہ کیے اور ہر جگہ سے نمائندے بلائے تاکہ ریاض میں ایک بڑا جلسہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

(۴)

ریاض کے بڑے محل کے میدان سب لوگ جمع ہوئے۔ علماء، مبلغین، امراء، شیوخ، سردار، عامل، گاؤں کے سر برآوردہ لوگ وغیرہ وغیرہ۔ سب آئے لیکن بجاد، ہتلان اور دویش نے شرکت نہیں کی اس سے صاف ان کے مافی الضمیر اور کھلی مخالفت کا پتہ چلتا تھا۔ جب سب لوگ میدان میں جمع ہو گئے، ابن سعود محل کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ایک کثیر مجمع تھا اور ہر شخص اس کے متعلق کچھ نہ کچھ اعتراض رکھتا تھا۔ یہ موقع ابن سعود کے لیے واقعی ذاتی قابلیت و وجاہت کی نمائش اور اثر آفرینی کا موقع تھا۔ ابن سعود نے سب کا نہایت متانت اور خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور اپنی تقریر شروع کر دی۔

"خدا سب سے بڑا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ جس وقت میں تمہارے پاس آیا، تم لوگ کس قدر ایک دوسرے سے علیحدہ

تھے اور کس طرح ایک دُوسرے کو لوٹ مار کے قتل کیا کرتے تھے۔
جن لوگوں کے ہاتھ تمہاری حکومت کی باگ تھی ــــ خواہ وہ عرب ہوں کہ غیر ملکی، تمہارے خلاف سازش کرتے رہے، انہوں نے تمہارے درمیان تفرقے ڈالے تاکہ تمہارا اتحاد ٹوٹ کر تمہاری قوت پارہ پارہ ہوجائے۔ میں جب تمہارے پاس آیا، کمزور تھا۔ سوائے خدا کے اور کوئی میرا مددگار نہ تھا کیونکہ تم سب جانتے ہو کہ میرے پاس صرف چالیس آدمی تھے۔ تاہم تم سب واقف ہو کہ میں نے تم میں کس قدر اتحاد اور یگانگت پیدا کردی۔

"میں نے کسی سے ڈر کر تمہیں یہاں طلب نہیں کیا ہے۔ پہلے بھی مجھے خدا پر بھروسہ تھا اور اب بھی ہے۔ میں دشمن کی فوج سے ذرا بھی نہیں ڈرتا کیونکہ خدا نے مجھے کامیاب بنایا ہے۔ خدا ہی کا خوف تھا جو میں نے تمہیں طلب کیا ہے..... میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں میں سے اکثر کو میرے اور میرے عاملوں سے متعلق اعتراض ہے۔ میں اعتراضات کو سننا چاہتا ہوں تاکہ اگر کچھ غلطیاں ہوئی ہوں تو پھر ان کا تدارک کیا جاسکے۔ اس سے خدا کی نظروں میں بھی میں اچھا رہونگا۔ .... ہاں اس سے قبل اس امر کا تصفیہ کرلو کہ آیا تمہیں میری قیادت پسند ہے کہ نہیں۔ اگر پسند نہ ہو تو پھر دوسرا کون ایسا

ہے جو میری جگہ یہ کام کر سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنے قوت بازو سے میری شخصیت کو دھکا نہیں پہنچا سکتا، میں خود خوشی سے اپنے کو تمہارے آگے پیش کر رہا ہوں کیونکہ میری خواہش یہ نہیں ہے کہ میں اس جماعت پر حکومت کروں جو مجھ سے ناراض ہے۔

"دیکھو تمہارے سامنے میرے خاندان کے اراکین ہیں۔ انہیں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔ تم جس کو منتخب کرو گے میں ایمانداری کے ساتھ اس کی امداد کرونگا اور میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ جو کوئی بھی میرے خلاف بولے گا اسے میں نہ تو اب سزا دونگا اور نہ آئندہ کبھی۔"

تقریر ختم ہونے کے بعد ابن سعود نے مجمع پر ایک متجسانہ نظر ڈالی۔ سبھوں نے بہ آواز بلند کہا "ہم سب راضی ہیں، ہم تمہارے سوا، کسی کو اپنا قائد بنانا نہیں چاہتے" اس پر ابن سعود نے کہا "ہاں اگر کسی کو میری ذات سے اعتراض ہے...... تو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ بلا خوف و خطر مجھ پر وہ ظاہر کر دو اگر اعتراض معقول ہے تو میں اسے قبول کرونگا اور اپنے آپ کو قانون کا پابند کرونگا۔"

"پس اے میری عزیز رعایا کہو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہو، مجھے بتلاؤ کہ لوگوں نے تمہارے قائد اور تمہارے

عہدہ داروں کے متعلق کیا نکتہ چینیاں کی ہیں۔"

اس کے بعد ان مختلف نمائندوں نے بہت سے اعتراضات کیے ابن سعود برابر ان کا تشفی بخش جواب دیتا گیا۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ متنازع فیہ مسائل پر علماء کے فتووں سے مدد لی گئی۔ غرض ابن سعود نے ان سب کی خاطر خواہ تشفی کی اور سب لوگوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو گئے۔ پہلے وہ دشمن بن کر آئے تھے اب جوشیلے دوست بن کر واپس ہوئے۔

۵

جیسے ہی یہ خبر دویش کو ملی، وہ سمجھ گیا کہ اگر اب ذری بھی سُستی کی گئی اور ابن سعود نے اسے بے دخل کر دیا۔ اس نے فوراً ہتلان اور بجاد کو بھڑکا دیا۔ یہ سب مل کر عراق اور نجد کے گاؤں پر دھاوا بولنے لگے۔ ابن سعود کے لیے اب یہ مناسب موقع تھا کہ وہ دویش کی علانیہ مخالفت کرے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ دویش اور اس کے ساتھی باغی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حافظ وہبہ کے ذریعہ اس نے انگریزوں سے معاملہ کر لیا۔ انگریزوں نے اسے امداد دینے کا وعدہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر عرب اس طرح بھٹک جائیں تو پھر ان پر قابو پانا مشکل ہوگا اور وہ ہمیشہ سرحد پر تنگ کرتے رہینگے۔ ساتھ ہی اس کے انگریزوں نے اس امر کا بھی انتظام کر دیا کہ

کویت، عراق اور شرق اردن سے بھی باغیوں کو کوئی مدد نہ دی جائے۔ ابن سعود نے جلوی کے ذریعہ عجمانیوں کی بھی سرکوبی کا انتظام کردیا۔

ابن سعود کے لیے اب آدمیوں کا فراہم کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اکثریت اس کی ہم نوا تھی۔ اس نے اطراف کے گاؤں سے لوگوں کو طلب کیا اور جب پندرہ ہزار آدمی جمع ہو گئے، تو ابن سعود نے فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حِصّہ کا سردار اپنے بھائی عبداللہ کو اور دوسرے کا اپنے بیٹے سعود کو بنایا اور یہ فوج لے کر بریدہ کے سامنے قیام کیا۔

کئی دن کی لڑائی کے بعد دویش کو محصور کرلیا گیا۔ ابن سعود نے دویش کے پاس اپنا قاصد روانہ کیا کہ وہ اس کے سامنے آکر اپنی باغیانہ حرکت کا جواب دے۔ دویش نے انکار کردیا جس پر ابن سعود نے عبداللہ اور سعود کو حملہ کی اجازت دے دی۔ یہ اپنے آدمیوں کے ساتھ، برہنہ تلواریں لیے اس کے خیمہ کی طرف گئے دو گھنٹہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ دویش کے لوگوں نے زوردار مقابلہ کیا لیکن ابن سعود کی فوج کے آگے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بالآخر دویش بُری طرح زخمی ہوا اور اس کا بڑا لڑکا مارا گیا۔

دویش کو گرفتار کرکے ابن سعود کے سامنے لایا گیا۔ اس کے

ساتھ اس کی بیوی، بچے اور خاندان والے زار زار رو رہے تھے۔ دویش میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ حرکت کرسکتا۔ اس کے بچوں نے ابن سعود سے رُو رُو کر جان بخشی کی استدعا کی کیونکہ کسی کو توقع نہ تھی کہ دویش معاف کیا جائیگا۔ ابن سعود نے پہلے بہت غصہ سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اس کا غصّہ اتر گیا اور اس نے دویش کو معاف کردیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے ارطاویہ پہنچا دیا جائے اور ساتھ ہی اپنے خانگی ڈاکٹر مدحت کو اس کے علاج کے لیے روانہ کیا۔

ابن سعود نے ایک خاص مقصد کی تحت دویش کو معاف کیا۔ وہ صورتِ حال دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ مر رہا ہے۔ جب وہ خود ہی مر رہا ہے تو اسے مارنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ الٹے اسی کا نام ہوگیا کہ ایک بدمعاش اور باغی کے ساتھ بھی ابن سعود نے انتہا درجہ رحم سے کام لیا۔

اس کے بعد بجاد گرفتار کیا گیا اور اسے حبس دوام کی سزا دی گئی۔ دوسرے باغیوں کی بھی اچھی طرح سرکوبی کی گئی کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی گئی اور جس نے بھی مخالفت کی اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس طرح اس بغاوت کو فرو کرکے ابن سعود حج بیت اللہ کے لیے مکّہ روانہ ہوا۔

۶

لیکن بغاوت کا ابھی پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا۔ راکھ سے پھر شعلے اٹھنے لگے۔ دویش جسم کا مضبوط اور دل کا قوی تھا۔ دن بدن وہ اچھا ہوتا گیا اور ابن سعود کی معافی کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ پھر سے مخالفت کے بیج بونے لگا۔ اس کے ساتھی الاخوان ابھی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور ابن سعود کو نیست و نابود کرنے کے درپئے تھے۔ ہتلان اور دوسرے باغی جو ابن سعود کے ہاتھ سے بچ کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے تھے، ایک ایک کر کے آنے اور قبائل کو اُکسانے لگے۔ عجمان اور مطیر کے قبیلے پھر باغیوں کے ساتھ ہو گئے۔

جلوی نے اپنے لڑکے فہاد کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ فہاد نے موقع پا کر ہتلان کو قتل کر ڈالا لیکن بہت جلد ایک عجمانی نے اسے بھی زندہ نہ چھوڑا۔ جلوی کو اپنے بیٹے کی موت کا سخت رنج ہوا اور وہ یکدم بیمار پڑ گیا جس کے باعث باغیوں کو احسار کے باشندوں کو بھڑکانے کا بھی موقع مل گیا۔

ابن سعود کو ان واقعات کی اطلاع مکہ میں ہوئی۔ وہ فوراً دو سو جنگجو بہادروں کے ساتھ موٹروں میں بیٹھ کر ریاض پہنچا اور نہایت عجلت کے ساتھ اپنی فوج فراہم کر لی۔ اب کی

دفعہ موٹروں کی وجہ سے ابن سعود کو دشمن پر اچانک حملے کرنے میں بڑی مدد ملی اور باغی اس سے سخت پریشان ہو گئے۔ وہ ایسی لڑائی کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ اس پریشانی کے عالم میں عراق کے سرحدیوں نے دویش کے لوگوں پر حملہ کر دیا جس سے ان کی ہمت اور بھی ٹوٹ گئی۔ عجمانیوں نے اپنے گھروں کا راستہ لیا لیکن عتیبہ پر قیام کر کے ابن سعود نے ان مغرور جتھوں کی خوب خبر لی۔ لیکن دویش برابر لڑے جا رہا تھا، اسے کسی رحم و کرم کی امید نہ تھی۔ اب کی دفعہ بھی وہ سخت زخمی ہوا اور اس کا دوسرا لڑکا مارا گیا۔

یہ حال دیکھ کر وہ اپنے ساتھی مشہور اور باقی ماندہ فوج کو لے کر عراق کی سرحد کی طرف بھاگ نکلا اور وادیٔ بطن میں قیام کیا۔ اسے اطمینان تھا کہ اتنا جلد اب یہاں کوئی نہ آسکیگا لیکن ابن سعود کے آدمی موٹروں میں بیٹھ کر اس کے تعاقب میں نکلے اور دویش کی جماعت پر حملہ کر دیے۔

مشہور بھاگ کر عراق پہنچا اور وہاں سے شام پہنچ کر اس نے فرانسیسوں کے پاس پناہ مانگی۔ دویش بھی کویت کی طرف بھاگ نکلا لیکن راستے میں انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے ابن سعود کے حوالہ کر دیا جس نے اسے بجاد کے ساتھ ریاض کے قید خانہ میں قید کر دیا۔ اس دفعہ ابن سعود نے ذری بھی رعایت

نہیں کی بلکہ باغیوں کو بُری طرح قتل کیا، ان کے گاؤں جلا دیے اور ان کی زمینات پر قبضہ کرلیا۔ نافرمانبردار الاخوان کو ایک زور دار دھمکی دی جس کے بعد کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ابن سعود نے کہا

"یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہاری قدر کرتے ہیں، یہ نہ سمجھنا کہ تم نے ہماری خدمت کی ہے اور ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری حقیقی قدر و قیمت اسی میں ہے کہ پہلے خدا کی اطاعت کرو اور بعد ہماری ...... اور یہ نہ بھول جانا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا باپ، بھائی یا کوئی رشتہ دار ہماری تلواروں کا مزہ نہ چکھا ہو۔ ہم نے تمہیں تلوار سے رام کیا ہے، وہی تلوار اب بھی تمہارے سروں پر ہے۔ یاد رکھو، دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرنا۔ اگر ایسا کروگے تو تمہاری اور مٹی کی قدر برابر ہوگی۔ ہم نے تم پر تلوار ہی سے کامیابی حاصل کی ہے اور تمہیں تلواروں ہی میں جکڑے رکھینگے۔"

اس طرح بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہتلان مارا گیا، بجاد اور دویش قید گئے۔ ان کے بغیر اہل قبائل کیا کر سکتے؟ پھر سے ابن سعود کامران ہوگیا۔

سترھواں باب

موجودہ طرزِ حکومت

۱

یہ قصہ ختم ہونے کے بعد ابن سعود استحکام سلطنت کی طرف اپنی پوری توجہ سے کام کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ علماء اور وہابیوں کی قدامت پرستی ترقی کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ موٹر، ٹیلیفون، ٹیلگراف، لاسلکی، ہوائی جہازوں اور دیگر مشینریوں کی اسے سخت ضرورت تھی۔ اب اس نے تہیّہ کر لیا کہ کسی تاخیر کے بغیر یہ سب چیزیں مہیا کی جانی چاہییں۔

اس مقصد کے لیے اس نے مکہ سے باہر اور ریاض میں طاقتور نشرگاہیں قائم کر دیں، ہر جگہ ٹیلگراف اور ٹیلیفون لگوا دیے۔ لاریوں میں تک لاسلکی کے آلات نصب کر دیے گئے تاکہ وقتاً فوقتاً حکومت کے

عہدہ دار ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں اور فوج کو احکامات دیئے جا سکیں۔ خود ابن سعود نے کئی موٹریں خریدیں اور اوروں کو بھی اس کے لیے مجبور کیا۔ ۱۹۲۶ء میں نصف درجن سے زیادہ موٹریں نہ تھیں اور ۱۹۳۰ء میں ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے تجاوز کر گئی۔ ان کے لیے سڑکوں کا بھی انتظام کیا گیا۔

اس کے بعد ابن سعود نے بہت کچھ فوجی تنظیم کی۔ ایک باقاعدہ فوج بنائی اس فوج کو جدید آلات حرب کا استعمال بتلایا گیا۔ جنگی موٹریں اور طیارے خریدے گئے۔ اس دفعہ بھی الاخوان کو بے قاعدہ فوج میں شریک کیا گیا کیونکہ یہ لوگ فوجی خدمات کے بہت اہل اور بہادر تھے۔ اب سلطنت کے تمام کام ٹیلیفون، ٹیلگراف، لاسلکی اور موٹروں کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ کسی کو سر اٹھانے کی گنجائش نہ رہی۔ جہاں کسی نے سرکشی کی، فوراً اس کی اطلاع مل گئی موٹروں کے ذریعہ فوج روانہ کی گئی اور وہ فتنہ دب گیا۔ چنانچہ آل حرب نے بغاوت کی، فوراً اس بغاوت کو دبا دیا گیا۔ حسن ادریسی نے عسیر میں بغاوت کر دی اور اب وہ ابن سعود کی طرف کوچ کرنے والا ہی تھا کہ لاسلکی سے اس کی اطلاع مل گئی اور وہیں مدافعت کا انتظام ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی ابن سعود نے سرحدی ممالک سے دوستانہ

تعلقات پیدا کر لیے انگریزوں نے اسے خود مختار بادشاہ تسلیم کیا اور جدہ میں اپنا ایک نمائندہ روانہ کیا۔ فیصل بغداد نے بھی مصالحت کرلی۔ لیکن حسین کا بیٹا عبداللہ اب بھی اسی طرح برہم رہا، وہ اب بھی ابن سعود کو حجاز سے نکال باہر کر کے اپنا قبضہ جمانا چاہتا تھا لیکن جب ٹٹو نہ چل سکا تو مجبور ہو کر اس نے بھی دوستی کرلی۔ جنوب میں امام یحییٰ نے حسن ادریسی کی طرفداری کر کے ابن سعود پر حملہ کی دھمکی دی۔ ابن سعود نے اپنے لڑکے سعود کی سرکردگی میں باقاعدہ فوج سرحد پر روانہ کردی۔ مہینوں کی خط وکتابت کے بعد امام یحییٰ نے بھی مصالحت کرلی۔

جنگ وجدل سے فراغت پانے کے بعد ابن سعود نے اپنی رعایا کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اس کے لیے پیسے کی سخت ضرورت تھی، عرب ایک غریب ملک ہے اور دنیا کی تجارتی کساد بازاری نے اسے اور بھی مفلس و نادار بنادیا۔ حجاج کی تعداد بھی بہت کچھ گھٹ گئی تھی تاہم ابن سعود نے اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کردیا۔ سعودیوں کی پُرامن حکومت نے حجاج کے دل بڑھا دیے اور سال بہ سال حاجیوں کی تعداد میں اچھا خاصہ اضافہ ہوتا گیا اور آمدنی بھی کافی بڑھتی گئی۔

ابن سعود نے گاؤں اور شہروں میں بچوں کی تعلیم کے لیے مدارس کھول دیے، مصر اور شام سے اساتذہ بلوائے ان کے نصاب

کا زیادہ حصّہ مذہبی تعلیم پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے، جا بجا دواخانے قائم کیے گئے اور سفری دواخانوں کا انتظام کیا گیا تاکہ ڈاکٹر گاؤں اور قصبوں میں دورہ کر کے معمولی علاج اور ابتدائی طبی امداد سے متعلق ہدایات دیں۔ آمدنی بڑھانے کی خاطر اس نے مکہ سے جدہ تک ریل ڈالنے کا گتہ ایک ہندوستانی کمپنی کو دے دیا۔ امریکن اسٹانڈرڈ آئیل کمپنی کو بھی ایک گتہ دیا اور دوسری کمپنیوں کو سونے اور دیگر معدنیات کو دریافت کرنے کا گتہ دیا۔

بدویوں کو کام پر لگانے کے لیے اس نے زراعت شروع کرادی۔ اس کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ ماہران فن کو بلوا کر اس نے چشمے کھدوائے اور پمپ لگوائے جس سے بدوی زراعت کی طرف مائل ہو کر لوٹ مار کے دھندوں سے بے نیاز ہونے لگے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ابن سعود نے اپنے لوگوں کے لیے امن و امان کی فضا، پیدا کر دی اور ایک ایسی قوم کو جو سالہا سال سے خواب غفلت میں مدہوش پڑی ہوئی تھی، اچھی طرح سے جگا دیا اور ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے کہ جس پر چلنا ترقی و کامرانی کی ضمانت ہے۔

﴿ ۲ ﴾

اب ابن سعود نجد اور حجاز کا سلطان ہے۔ اس نے اتنی

بڑی سلطنت اپنی قوتِ بازو سے حاصل کی۔ جہلا کی منتشر جماعتوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا، ان کو قدامت پسندی کے قعرِ ذلت سے نکال کر متمدن قوم بنانا اسی کی قوت ارادی اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب کہ عرب کی سرزمین پر لوٹ مار اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ سخت سے سخت جرائم کے لیے کوئی سزا نہ دی جاتی تھی۔ تعلیم و تعلم سرے سے مفقود تھے، گویا عرب وحشیوں کا مسکن تھا۔ لیکن ابن سعود نے یکہ و تنہا اپنے وطن کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ قدم قدم پر وہ ناامیدیوں سے دوچار ہوتا گیا اور بسا اوقات اس نے جانکاہ مصیبتیں جھیلیں لیکن ان سے اس کے عزم صمیم اور استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی دھن میں ناممکن کو ممکن بناتا جارہا تھا۔ اسے اپنے خدا پر کافی بھروسہ تھا بالآخر اس کا مقصد برآیا، اس نے عرب میں اب ایک ایسی حکومت قائم کردی ہے جہاں خداوند کریم کے احکامات کی پابندی اس شدت سے ہوتی ہے کہ دوسری کوئی اسلامی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ چوری کے لیے ہاتھ کاٹ دینا، لوٹ مار پر سخت سزائیں دینا، قتل کے بدلہ قصاص، بے نمازیوں کو سزا —— یہ سب اس دیار کے چلتے قانون ہیں جس پر آج ابن سعود کی حکومت ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ابن سعود کی زندگی سادگی کا

نمونہ ہے۔ شان وشوکت سے وہ کوسوں دور رہتا ہے۔ غلام ہو کہ امیر، ہر ایک کو عام اجازت ہے کہ اس کے آگے آ کر اپنے معاملات پیش کرے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے اور اس کے دربار میں، معاملہ کی حد تک کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔

بیرونی ممالک کے لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ نہایت عمدہ ہے، باوجود مالی مشکلات کے اپنی سلطنت کا وقار قائم رکھنے کے لیے وہ لوگوں کو بہت ہی گراں قدر تحفے دیتا ہے، سیاحوں کی دعوتیں کرتا ہے، اور ہر شخص سے خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو نہایت عمدگی سے ملتا ہے۔ اکثر ممالک کے روساء جب حج کے لیے مکہ جاتے ہیں تو ابن سعود ان کے لیے ان کی شان کے مطابق انتظامات کرتا ہے، اور حتی المقدور تحفے بھی روانہ کرتا ہے۔ عام طور پر بیرونی ممالک کے حاجی اس کی حکومت سے خوش ہیں کیونکہ بدوی دور کے بعد سعودیوں کی حکومت آئیہ رحمت ثابت ہو رہی ہے۔

اگرچہ اس وقت اندرونی بغاوتیں بہت بڑی حد تک فرد ہو چکی ہیں تاہم ابھی اس کے چند مخالف باقی ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں، آہستہ آہستہ وہ بھی رام ہو جائینگے۔ چنانچہ حال ہی میں (۱۹۳۵ء) حج کے موقعہ پر چند یمنیوں نے

ابن سعود پر خنجر سے حملہ کر دیا لیکن اس کے لڑکے اور دوسرے ساتھیوں نے ان بدمعاشوں کو فوراً گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔

بہرحال ابن سعود خدا کے خوف اور خدا ہی کے بھروسہ پر اپنی حکومت چلا رہا ہے خدا کی کتاب اس کا قانون ہے۔ اور یہی حقیقی اسلام ہے۔

تمت

اشاریہ

— ا —

ابن رشید۔ ۴۵، ۴۸، ۴۹، ۵۱ – ۵۵، ۵۷ – ۵۹، ۶۵، ۶۸، ۷۰، ، ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۶، ۱۴۹، ۱۵۱،

ابن سعود کا بچپن ۸، ۹

〃 پر گٹھیائی بخار کا حملہ ۱۶

〃 کی ربع الخالی میں وحشیانہ زندگی ۱۸، ۱۹۔

〃 کی پہلی شادی ۲۲

〃 کی پہلی ناکام مہم ۲۵

〃 کی ریاض پر چڑھائی کیلئے روانگی ۲۳

〃 کا ریاض پر حملہ ۳۹ – ۴۳

〃 کا رشیدیوں سے مقابلہ اور فتح ۵۱، ۵۳

ابن سعود نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام ۵۷

〃 گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا ۲۱،

〃 کی مبارک سے پرتپاک ملاقات ۹۴

〃 کا شکسپیر سے معاہدہ ۱۹۱۴ء ۹۷

〃 اور ہفوف کا محاصرہ، پیر گولی سے زخمی ۱۰۳

〃 نے میدان جنگ میں عقد کیا ۱۰۴

〃 کے خانگی حالات اور برتاؤ ۱۱۸، ۱۱۹

〃 نے حسین کو شکست دی ۱۴۱

〃 کی سر پرسی کاکس سے ملاقات ۱۴۷

ابن سعود کا شمریوں پر حملہ اور ابن رشید
کی بیوہ سے عقد ۱۵۱
" سلطان نجد ۱۵۲
" پر سرخ بادہ کا حملہ ۱۶۰
" نے ملاؤں کے آگے دویش
کا معاملہ پیش کیا ۲۱۰
" کی معرکتہ الآرا تقریر ۲۱۷، ۲۱۸
" پر یمنیوں کا حملہ ۲۳۱
احمد سلیم کا لڑکا ۱۴۹
احمد سودیری، ۷
اخوانی نوآبادیات ۹۰
الن بی ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۳۵
امان اللہ ۲۰۵
امریکن اسٹانڈرڈ آئیل کمپنی ۲۲۸
انجمن اتحاد و ترقی ۴۷

ب

بجاد، شیخ عتیبہ ۱۷۲، ۱۷۸، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۴

بریدہ شہر پر ایک سو آدمیوں کو سولی
۳۱
بل ہے ون، لارڈ ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۵، ۱۳۶، ۱۳۷

ت

ترکی، ابن سعود کا لڑکا ۳۳، ۱۳۶

ج

جابر، مبارک کا بیٹا ۱۰۷
جلوی، ۳۰، ۳۲، ۳۵، ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۲، ۴۳، ۴۷، ۷۴، ۱۰۰، ۲۲۰
جمال پاشا، ترکی گورنر ۱۱۰
جو اسیر جروالا ۳۸، ۳۹
جوہرہ ۳۶، ۱۳۸

ح

حافظ پاشا ۱۹
حسن ادریسی ۱۹۷، ۲۲۶، ۲۲۷
حسین جراد ۵۵
حسین، شریف مکہ ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۱، ۸۶، ۸۷، ۹۳، ۹۶

۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۴-
۱۲۶، ۱۲۸- ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۴۲
۱۴۴- ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۸-
۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۸۱، ۱۸۲،
۱۸۶، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۲۷

دارِیہ (درعیہ) ۵

دولوجی، وزیرِ خارجیہ ۱۷۷

دویش ۲، ۷۲، ۷۳، ۸۱، ۱۳۰، ۱۳۱،
۱۵۰، ۱۶۹، ۱۹۸، ۲۰۷، ۲۰۹،
۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۹- ۲۲۴

ز

زاہد، حسین کا لڑکا ۱۴۶

س

سارا ۶، ۷

سعد، ابن سعود کا بھائی ۷، ۴۷، ۷۵،
۷۶، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۲۰،
۲۲۰

سعدن، شیخ منطفک ۲۸، ۹۳

سعود، ابن سعود کا لڑکا ۱۵۰، ۱۷۷،
۲۰۳، ۲۰۵

سعودِ اعظم ۶، ۹، ۴۶

سعود، عبدالرحمٰن کا بھائی ۱۱، ۱۲

سلیم ۱۰۲- ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۲۴، ۱۲۷،
۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۰، ۱۴۷، ۱۴۹

سلیم، شیخ قبیلہ شمر ۱۲، ۱۳

سنوسی، شیخ ۱۸۰

ش

شجرۃ الدر، ملکۂ مصر ۱۹۳

شیکسپیر، انگریزی قونصل ۹۳، ۹۵، ۹۷،
۹۸

ط

طویل، ناظم کروڑگیری جدہ ۱۷۳، ۱۷۸

ع

عبدالرحمٰن ۶، ۸، ۹، ۱۱، ۱۳- ۲۱، ۲۸،
۳۰- ۳۴، ۴۶، ۵۳، ۵۶، ۵۷
۶۳، ۸۸، ۸۹، ۱۰۲، ۱۲۶،
۱۵۲، ۱۷۰، ۱۹۹، ۲۱۵

عبداللہ، حسین کا لڑکا ۷۵، ۸۶، ۹۶،